عید میلاد النبی مبارک

بچوں کا خوبصورت میگزین، روایت اور جدت ایک ساتھ

ماہنامہ

الف نگر

ALIF NAGAR

لاہور

ستمبر، اکتوبر 2021ء

نورِ صبح

ALIF KITAB

ماں کا آکاش

آپریشن ضربِ عضب کے پہلے جانباز شہید آفیسر

کیپٹن آکاش آفتاب ربانی

کی دلیرانہ زندگی اور شہادت کی مکمل داستان

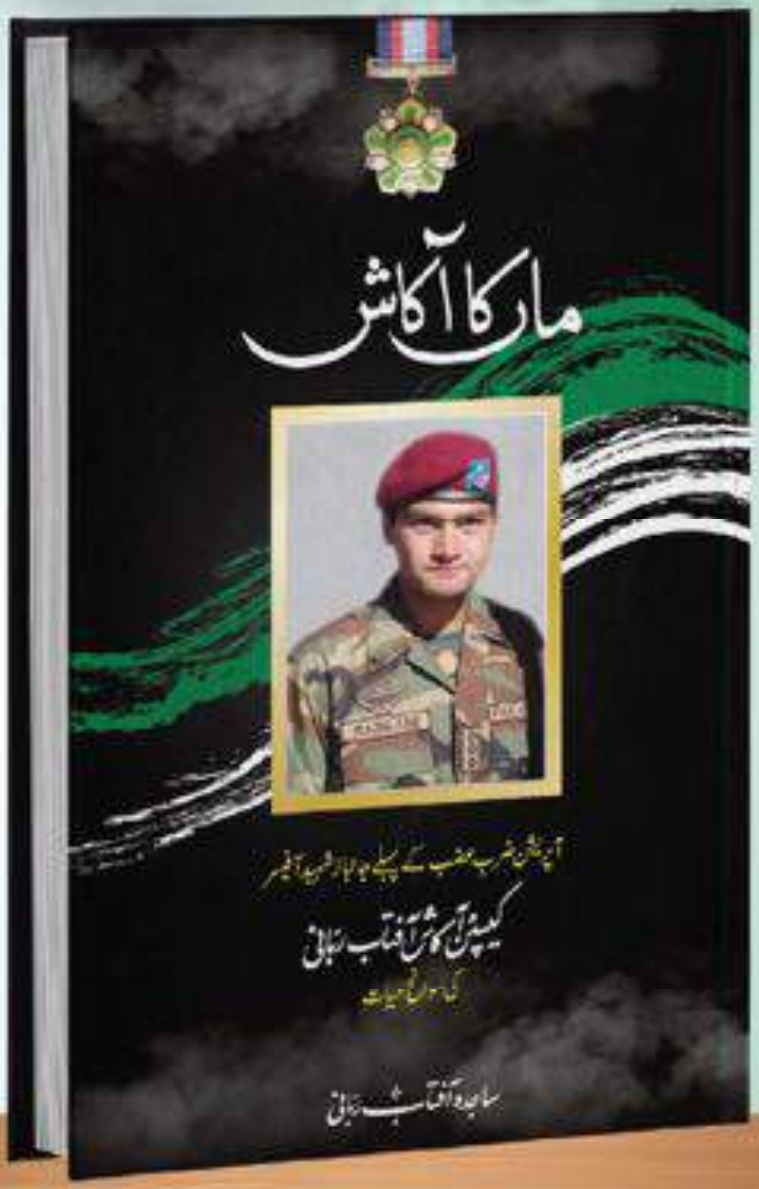

0321 8460220

ابھی آرڈر کریں

بچوں کا خوبصورت میگزین، روایت اور جدت ایک ساتھ

ماہنامہ الف نگر لاہور

ALIF NAGAR

جلد: 04 ستمبر، اکتوبر 2021ء شمارہ: 04-05

الف نامہ

پیارے دوستو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مجسمِ اخلاق، رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 12 ربیع الاول پیر کے دن صبح صادق کے وقت اِس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت اہلِ عرب کفر، شرک اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری کائنات کے لیے ''رحمت اللعالمین'' بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ بزرگوں کی عزت کرتے، چھوٹوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے، کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور ہمیشہ سچ بولنے پر ہی آپ کو ''صادق اور امین'' کا خطاب دیا گیا۔

پیارے بچو!

ہم اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جشنِ ولادت تو بہت شان سے مناتے ہیں لیکن جشن منانے کے ساتھ ساتھ ہمیں چاہیے کہ ہم نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کریں اور اُس راستے پر چلیں جو اُنہوں نے ہمیں دکھایا۔ کیونکہ اصل کامیابی اور فلاح تو اِسی میں ہے۔ آیئے مل کر تین بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں تاکہ ہمیں بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت، شفاعت اور محبت حاصل ہو سکے۔

اب بات ہو جائے آپ کے پسندیدہ شمارے کی، جس میں آپ کے لیے دلچسپ، رنگا رنگ اور بہت سی خصوصی کہانیاں موجود ہیں۔ اِن کہانیوں کو پڑھیے ان سے لطف اندوز ہوں اور اپنی قیمتی رائے سے ہمیں آگاہ ضرور کریں۔ انعامی سلسلوں میں انعام حاصل کرنے والوں کو ہماری طرف سے بہت مبارکباد قبول ہو۔

والسلام

(ادارہ)

عمیرہ احمد
چیف کانٹینٹ آفیسر

ایڈیٹر: عائشہ اطہر
سب ایڈیٹر: خالد محی الدین
معاون: آمنہ ارشد
آرٹ منیجر: ثمین توقیر
گرافک ڈیزائنگ: محمد عباس حسین
کمپوزنگ: ثاقب سلطان
ایڈورٹائزنگ/مارکیٹنگ/سرکولیشن
روحیل آفتاب 0321 846 0220

زیرِ اہتمام: الف کتاب پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

قیمت
فی شمارہ: -/150 روپے | سالانہ (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک): -/1000 روپے

خط کتابت کے لیے: ماہنامہ الف نگر B-1، وائٹ ہاؤس لین 2، سندر داس روڈ، لاہور۔
فون نمبر: 042-36300351 | 0306-6665360
فیس بک: alifnagarofficial یوٹیوب: alifnagarofficial
ای میل: submissions.alifnagar@alifkitab.com

کھل جا سم سم

ستمبر، اکتوبر 2021ء

03 حمد — نبیل احمد

04 نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم — ارسلان اللہ خان

05 دادا جان کی بیٹھک — سمیعہ علی میمن

06 جھولا — فضہ شکیل

08 کلوروڈم ڈم — سارہ قیوم

11 ستمبر یاد رکھنا (نظم) — محمد رمضان شاکر

12 نورِ صبح — عائشہ اطہر

15 رحمۃ للعالمین — حمیرا اللہ یار

16 سُپر ہیرو — قرۃ العین خرم ہاشمی

18 ذرا سا پانی — سیدہ اقرا اعجاز

19 وقتِ فجر (نظم) — ایوب اختر

20 سرکھی چوس — روبینہ کبیر خان

24 سونے چاندی کا سر محل — احمد عدنان طارق

26 مٹی کا قرض — الطاف حسین

29 ڈاکٹر بلو بلو گنڑا — نوید احمد خان

30 ساشا اور کوکو — فرزین لہرا

32 وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو — عائشہ اے بٹ

34 شرارتی پردے — حسن اختر

36 مستقبل (نظم) — قیصر جہاں

37 شیف ثانی — صائمہ مسلم

38 چالاک سرمان (ماخوذ) — آمنہ ارشد

48 سچا جھوٹ — اختر سردار چوہدری

50 پاک فضائیہ کے شاہین — حافظ محمد دانش عارفین

57 بارش (نظم) — شازیہ ستار نایاب

58 میجک — ولید عبداللہ

60 لاڈلے — عنیزہ فضل داد

62 چُنی چڑیا — نظیر فاطمہ

64 خرگوش کا بہترین دن — جاوید بسام

66 انوکھی بھوک ہڑتال — حنا نرجس

68 بانو اور بونے — بنت محمد صدیق

حمد

نبیل احمد

گماں کا ساز اللہ ہُو
مری آواز اللہ ہُو

اجل کا ساز اللہ ہُو
ہر اک آواز اللہ ہُو

کسی پر کھل نہیں پایا
خدا کا راز اللہ ہُو

نمازِ عشق پڑھتا رہ
مرے ایاز اللہ ہُو

نہ دن ہو خوبصورت کیوں
جو ہو آغاز اللہ ہُو

نعتِ رسول ﷺ

ارسلان اللہ خان

صداقت ملی ہے، امانت ملی ہے
ہمیں مُصطفیٰ ﷺ سے ہدایت ملی ہے

نبی مُحتشم ﷺ کا کہا کس جس نے مانا
اُسے دین و دُنیا کی راحت ملی ہے

چلوں گا میں اُنہی کے نقشِ قدم پر
جنہیں عشقِ احمد ﷺ کی دولت ملی ہے

وہ ﷺ معراج کی شب گئے لامکاں تک
اُن ہی کو فقط یہ فضیلت ملی ہے

کریں گے شفاعت نبی ﷺ روزِ محشر
اُنہیں رب سے اس کی اجازت ملی ہے

درودوں کا تحفہ جو بھیجا نبی ﷺ کو
مُجھے اُلجھنوں سے فراغت ملی ہے

میں ہوں ارسلاںؔ اُمّتی مُصطفیٰ ﷺ کا
بفضلِ خُدا یہ سعادت ملی ہے

چنو، منو اور فسادی پُنو

سمیعہ علی میمن

دادا جان! بچوں کے شور شرابے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکلے اور باغ کی جانب تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ جیسے ہی وہ باغ میں داخل ہوئے، تو سعد ایک پودے کے پیچھے چھپا بیٹھا نظر آیا، لیکن دادا جان کا ہدف تو وہ تلخ آوازیں تھیں جن سے عیاں تھا کہ بچے آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھے تو عفان اور حسان اونچی آواز میں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے اور پاس کھڑی عائشہ روہانسی صورت بنائے انھیں دیکھ رہی تھی۔

دادا جان کو دیکھتے ہی دونوں چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور عائشہ کے چہرے پر بھی مسکان دوڑ گئی کہ اب دادا جان ان کی خبر لیں گے۔ دادا جان کو مسئلہ سمجھنے میں دیر نہ لگی، کیونکہ وہ ان کی ایک دوسرے پر الزام تراشی سن چکے تھے۔

سعد کہاں ہے؟ دادا جان نے دانستہ پوچھا، حالانکہ وہ اُسے چھپا بیٹھا دیکھ چکے تھے۔

اتنے میں سعد گردن جھکائے بوجھل قدموں سے ان کے پاس چلا آیا۔ چاروں بچے آلتی پالتی مار کر دادا جان کے گرد بیٹھ گئے۔ دادا جان نے چاروں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولے میں آج آپ کو ننھے منے بڑے ہی پیارے طوطوں کی کہانی سناتا ہوں۔ بچے کہانی سننے کے لیے پوری یکسوئی سے تیار ہو گئے۔

دادا جان گویا ہوئے:

''دو چھوٹے طوطے چنو اور منو آپس میں بہت ہی اچھے دوست تھے۔'' وہ ہمیشہ ایک ساتھ کھیلا کرتے۔ ان دونوں کی مائیں جنگل سے جو بھی کھانے کو لاتیں، وہ آپس میں مل بانٹ کر کھاتے۔ جنگل میں ہر کوئی ان کی دوستی کی تعریف کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد دوسرے جنگل سے ایک طوطی چنو منو کے جنگل میں رہنے آئی۔ اس طوطی کا چھوٹا سا بچہ پُنو بھی ساتھ تھا۔ پُنو کی جلد ہی جنگل کے سبھی چھوٹے طوطوں سے دوستی ہو گئی۔

پُنو ان کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اس کی نظر بھاگم بھاگ کھیلتے چنو منو پر پڑی۔ پُنو ان دونوں کے بارے میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ دونوں کتنے پیارے طوطے ہیں، کیا یہ بھی یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں! ان کے نام چنو منو ہیں۔'' چھوٹے طوطوں نے یک زبان ہو کر بتایا۔

''میں بھی ان سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔'' پُنو نے خواہش ظاہر کی تو ایک طوطے نے کہا۔ ''لیکن یہ دونوں کہتے ہیں دوست ایک ہی اچھا ہوتا ہے۔'' چنو کا اچھا دوست منو ہے اور منو کا اچھا دوست چنو ہے۔ اس لیے وہ کسی اور سے دوستی نہیں کرتے۔ یہ بات سن کر پُنو کا دل ٹوٹ گیا تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ دوسرے دن اس نے چنو کو درخت کی ٹہنی پہ بیٹھا منو کا انتظار کرتے دیکھا تو اس کے پاس چلا آیا۔

السلام علیکم ''چنو! میرا نام پُنو ہے اور میں اس جنگل میں نیا آیا ہوں۔''

''وعلیکم السلام، اچھا! میں بھی تمہیں آج ہی دیکھ رہا ہوں۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟ پُنو نے چنو کے قریب چکر کاٹتے ہوئے کہا۔'' ہاں مگر جلد ہی میرا دوست منو آ جائے گا تو میں اس کے ساتھ کھیلوں گا۔

''ارے! منو کو شاید میں نے کل دیکھا تھا۔ منو وہی ہے نا جو لال اور پیلے رنگ کا طوطا ہے لیکن اللہ کسی کو منو جیسا دوست ..... پُنو نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔''

''ہاں منو کا رنگ لال اور پیلا ہے لیکن تم اس کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔''

''وہ..... وہ میں کہہ رہا تھا کہ منو مجھے تمہارا اچھا دوست نہیں لگتا کیوں کہ اچھے دوست پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتے اور میں نے منو کو کل دوسرے طوطوں سے تمہاری برائی کرتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ چنو بہت باتونی ہے اور سارا دن میرا سر کھاتا ہے۔ اس لیے میں اب اس سے دوستی ختم کر دوں گا۔'' پُنو کی بات سن کر چنو کو دکھ ہوا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 35

جھولا

فضہ شکیل

چھوٹے سے باغیچے میں کھلنے والے دروازے سے وہ لاؤنج میں داخل ہوا۔

''آپ باہر کیا کر رہے تھے؟'' احمد نے اپنے بیٹے مرتضیٰ سے پوچھا۔

''بابا میں جھولے کی جگہ دیکھنے گیا تھا۔'' اس نے باپ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کونسا جھولا؟''

''بابا یاد کریں آپ نے کہا تھا جب مصطفیٰ اور مجتبیٰ کی پہلی سالگرہ آئے گی تو آپ ہمیں ایک جھولا لے کر دیں گے تاکہ میں روز شام کو ان کے ساتھ وہاں بیٹھ کر انہیں کہانی سنا سکوں۔''

اپنے باپ کو یاد دلاتے ہوئے وہ پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں بابا بھول تو نہیں گئے۔ دس سال کا مرتضیٰ اپنے چھوٹے اور جڑواں بھائیوں کی آنے والی پہلی سالگرہ کے لیے بہت پرجوش تھا۔

''لیکن مرتضیٰ باغیچے میں جگہ نہیں ہے۔ درخت کی وجہ سے پہلے ہی اتنا بڑا حصہ مختص ہے باقی میز کرسیاں ہیں اور چھوٹے چھوٹے پودے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ نئے جھولے کی جگہ مشکل ہے۔ میں ان دونوں کے لیے کرسیاں لے آؤں گا وہ آسانی سے رکھی جائیں گی۔''

احمد نے اسے سمجھایا۔

''بابا ہم درخت کٹوا دیتے ہیں۔ ایک ہی تو درخت ہے اس کی آکسیجن کم ہو گئی تو کوئی بات نہیں۔'' مرتضیٰ کسی بھی طرح جھولا لینا چاہتا تھا۔

''اگر آپ کو جھولا ہی چاہیے تو ہم اس کو لاؤنج میں رکھ لیتے ہیں۔''

''بابا پلیز درخت کٹوا کر وہاں جھولا رکھوا دیں ناں۔''

بیچاری سی شکل بناتا وہ اب باپ کی منت کر رہا تھا۔

''آپ سو جائیں ہم صبح پھر اس پر بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے شب بخیر بابا!''

مرتضیٰ صوفے سے اتر کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ جہاں ماما نے مصطفیٰ اور مجتبیٰ کو سلا دیا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔

.....☆.....

مرتضیٰ کی آنکھ اپنے بستر پر ہی کھلی تھی۔ اٹھنے کی وجہ گلے میں چبھن اور خراش تھی۔ کمرے میں بڑھتی ہوئی گرمی بھی اسے گراں گزر رہی تھی۔ سر تکیے سے اٹھا کر جلدی سے ماما کو دیکھا لیکن ماما اپنی جگہ پر نہیں تھیں۔ کوئی بھی نہیں تھا کمرے میں، کھڑکی سے ہٹے پردے باہر کا منظر بھی واضح کر رہے تھے جہاں آسمان پر آتشی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ مرتضیٰ کو لگا جیسے کسی نے آسمان پر آگ لگائی ہو۔ مرتضیٰ پوری طرح سے اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ ہلکی کھانسی

کی وجہ سے گلہ اور درد کرنے لگا۔ گرمی بھی اتنی زیادہ تھی کہ پسینے سے برا حال ہو رہا تھا۔ کمرے سے باہر آتے ہی وہ کچن کی طرف گیا، مشکل سے آدھا گلاس پانی ڈھونڈ کر پیتے وہ لانج کی دیوار گیر کھڑکی تک آیا جہاں سے ان کا باغیچہ نظر آتا تھا۔ لیکن حیرت کا جھٹکا اسے تب لگا جب اٹھائیس سال پرانا ان کا درخت وہاں نہیں تھا۔ رنگ برنگے پھولوں والے چھوٹے چھوٹے پودے بھی غائب تھے حتیٰ کہ باغیچے کی گھاس بھی جل کر کالی اور کہیں سے پیلی تھی۔

''ماما بابا!''

ماں باپ کو آوازیں دیتے اسے ایک اور جھٹکا لگا اور اس کی آنکھیں یک دم کھلیں۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھا جہاں اے سی کی ٹھنڈک میں سب سو رہے تھے۔

''جو سب ابھی دیکھا وہ کیا تھا؟ کیا کوئی خواب دیکھ لیا یا شاید مستقبل کا منظر۔ دو دن پہلے ہی تو سوشل اسٹڈیز کی ٹیچر نے پڑھایا تھا سب درختوں کی اہمیت پر۔''

سر نفی میں ہلاتے آیت الکرسی پڑھتے وہ پھر سے سونے لگا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا بابا کو اب کیا کہنا ہے۔

.....☆.....

ناشتے کے بعد احمد نے مرتضیٰ کو باغیچے میں آنے کا کہا۔ چھوٹی سی میز کے گرد کرسیوں پر دونوں بیٹھ گئے۔ ''مرتضیٰ! اگر ہم درخت کاٹ دیں گے تو ہمارے باغیچے میں سایہ بھی نہیں رہے گا اور۔''

''بابا! ہم درخت نہیں کاٹیں گے۔''

مرتضیٰ نے باپ کی بات میں وقفے کے دوران فوراً کہا۔

''پھر جھولا کہاں رکھیں؟ اور اب کیوں نہیں کٹوانا چاہتے آپ؟ درخت؟''

''درختوں کے بہت فائدے ہوتے ہیں، ٹیچر نے بتایا تھا اور جھولا ہم اندر رکھ لیں گے لیکن کہانی پھر میں گھاس پر بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔''

اپنا سارا پلان باپ کے گوش گزار کرتے وہ خوش تھا۔

''آپ ایسا کریں۔ درختوں کے چار فائدے بتائیں۔''

(1) یہ ہمیں آکسیجن دیتے ہیں۔

(2) یہ درجہ حرارت کو بھی کم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

(3) ان سے بارش بھی جلدی آتی ہے۔

(4) یہ ہمیں جامن بھی دیتا ہے۔

احمد مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا جس نے سوشل اسٹڈیز میں درختوں کی اہمیت کو اچھے سے یاد کیا تھا۔ ''تو پھر نہ کٹوائیں؟''

''نہیں بابا! مصطفیٰ اور مجتبیٰ کو بھی تو آکسیجن چاہیے نا بڑے ہو کر۔''

چھلانگ لگا کر کرسی سے اترتے وہ اندر بھاگ گیا۔☆

بقیہ: وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

اندھا دھند اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی اُن میں سے ایک نے اسد علی کا بازو پکڑا اسد علی نے گرم تیل اُس پر اُلٹ دیا کھولتا ہوا تیل اُس کے چہرے پر گرا اور گالیوں کا طوفان اُس کے منہ سے نکلا۔ وہ نیچے گر گیا۔ دوسرے شخص نے اسد علی کو پکڑ لیا تھا۔ وہی سٹیل کا جگ اسد علی نے اُس کے سر پر دے مارا۔ وہ اسد علی کو گھسیٹتا ہوا ریڑھی سے دُور لے گیا۔ اسد علی نے بھی اُسے زور سے پکڑ رکھا تھا اسد علی کی گرفت بہت مضبوط تھی دہشت گرد کو اُمید نہیں تھی کہ دبلا پتلا سا لڑکا اس طرح اُسے پکڑے گا اور اس طرح اُس کے سامنے ڈٹ جائے گا۔ اُس نے بہت مشکل سے اسد علی سے اپنا آپ چھڑوایا اور بھاگا۔ اسد علی بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔ یہ اندھا ہے اور میرے پیچھے ایسے بھاگ رہا ہے جیسے دیکھ سکتا ہو۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی آنکھیں روشنی سے محروم تھی لیکن سونگھنے کی حس بہت تیز تھی۔ اسد علی اُس کے گندے سگریٹوں کی بدبو سے اُس کو پہچان رہا تھا۔

''بچوں کو مارنے نہیں دوں گا'' اسد علی نے اُسے دبوچ رکھا تھا بھاگتے بھاگتے وہ سکول سے کچھ دور پانی کے تالاب کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دونوں گتھم گتھا تھے اس دھینگا مشتی میں اسد علی کے ہاتھ میں وہ بٹن آ گیا تھا جس کی بارودی مواد سے بھری جیکٹ اُس نے پہن رکھی تھی۔

''یہ مت دبانا'' دہشت گرد کی آواز کانپی۔

''تاکہ تم سکول پہنچ کر اسے دباؤ۔'' اسد علی نے کلمہ شریف کا ورد کرتے ہوئے وہ بٹن دبا دیا۔ فضا زوردار دھماکے کی آواز سے گونجی۔ ہر طرف سیاہ دھواں ہی دھواں تھا اور اُس دھوئیں میں ایک شہید کے لہو کی مہک بھی تھی۔

اسد علی کی آنکھیں روشنی سے محروم تھی لیکن اُس کا دل وطن کی محبت سے روشن اور سرشار تھا۔ اُس کی بہادری، ہمت اور دلیری پر پوری قوم کا سر فخر سے بلند تھا۔ حکومت کی طرف سے اسد علی کو ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا گیا تھا۔ اسد علی نے شہادت کا رتبہ تو حاصل کیا لیکن بہت سی گودیں اُجڑنے سے بچا لیں۔ ایک بہت بڑی تباہی تھی جسے اُس نے ہونے سے روک لیا تھا اور جب تک ہماری مٹی کی آبیاری شہیدوں کے خون سے ہوتی رہے گی تب تک وہاں ایسی ہی فصل گل اُترے گی جسے کبھی زوال کا اندیشہ تک نہ ہوگا۔

(انشاءاللہ)

اول انعام
''رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ''
حمیرا اللہ یار
ایک ہزار روپے کی انعامی کتب

اول انعام
''وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو''
عائشہ اے بٹ
ایک ہزار روپے کی انعامی کتب

بہترین تبصرہ
سلیمان یوسف سمیجہ
پانچ سو روپے کی انعامی کتب

کلوروڈم ڈم

سارہ قیوم

منا مٹی کھاتا تھا اور ڈانٹ زینب کو پڑتی تھی، کیونکہ وہ بڑی بہن تھی اور منے کا دھیان رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ نہ صرف منے کا بلکہ طوطے اور مرغیوں کا بھی۔ زینب تنگ آ گئی تھی۔ اُس کی زندگی ہمیشہ سے ایسی مشکل نہیں تھی۔ اپنی زندگی کے آٹھ سال اس نے بہت ہنسی خوشی گزارے تھے۔ گھر میں دادا دادی تھے، ماما پاپا تھے، منا تھا اور دو ملازم بھی تھے۔ زینب سکول جاتی تھی اور واپس آ کر گڑیوں سے کھیلتی تھی۔ پھر کرونا آ گیا اور سکول بند ہو گئے۔ زینب گھر میں قید ہو گئی۔ پاپا کا بزنس ٹھپ ہو گیا۔

ملازم فارغ کرنے پڑے۔ گھر چلانے کے لیے ماما اور دادی نے گھر میں بزنس شروع کر دیا۔ کھانا بنا کر سپلائی کرنے کا بزنس۔ اب ماما اور دادی تو ہر وقت کچن میں مصروف رہنے لگیں اور منا، طوطا اور مرغیاں زینب کے سر پر آ پڑے۔

کبھی کبھی زینب کو لگتا تھا اس کا گھر، گھر نہیں چڑیا گھر ہے۔ صبح صبح مرغیاں ڈربے سے نکالی جاتیں تو وہ سارے لان میں پھیل جاتیں اور خوب شور مچاتیں۔ ان مرغیوں کی تاک میں بلیاں آ جاتیں اور ان بلیوں کو دیکھ کر دادا ابو کا کتا جھبرو پاگل ہو جاتا۔ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ بلیاں مرغیوں کے پیچھے بھاگتیں اور جھبرو بلیوں کے پیچھے اور مرغیاں جھبرو اور بلیوں دونوں کو ٹھونگیں مارتیں۔ جھبرو کی بھوں بھوں، مرغیوں کی کڑکڑ اور بلیوں کی میاؤں میاؤں میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ اب بھلا طوطا کیوں پیچھے رہتا؟ اس سارے شور شرابے میں حصہ ڈالنا اُس کا بھی فرض تھا۔ وہ چیخ چیخ کر میاں مٹھو چوری کھا۔ میاں مٹھو چوری کھا کی گردان الاپے جاتا اور درختوں پر بیٹھے پرندے چلا چلا کر اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے۔

جھبرو بائیر تھا، مرغیاں احمق تھیں، بلیاں مغرور تھیں اور طوطا کریک تھا، لیکن یہ سب ایک طرف اور منا ایک طرف۔ وہ ڈیڑھ سال کا تھا اور اس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ صرف چلتا ہی رہتا تو پھر بھی ٹھیک تھا، لیکن وہ تو ہر چیز پر چڑھ جاتا تھا۔ کرسیوں پر، سیڑھیوں پر، کھڑکی پر، درخت پر، حتیٰ کہ جھبرو پر بھی۔ جب وہ چھوٹا تھا تو زینب کو اس پر پیار آتا تھا، لیکن اب اسے منے پر غصے کے سوا کچھ نہ آتا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہلکان ہو جاتی لیکن پھر بھی وہ نظر بچا کر کہیں نہ کہیں جا چڑھتا اور گر کر چوٹ لگوا بیٹھتا۔

اور ڈانٹ زینب کو پڑتی۔ اور تو اور وہ اب مٹی بھی کھانے لگا تھا۔ اگر اسے باہر نہ لے جایا جاتا تو وہ سبزی کی ٹوکری میں گھس جاتا اور مٹی سے بھرے آلو اٹھا کر کچے ہی کھانے لگتا۔ اسے صرف تین لفظ بولنے آتے تھے، آنا، آپا اور آلو۔ جب کبھی زینب گڑیوں سے کھیلنے لگتی یا کوئی کتاب پڑھنے لگتی تو منا ''آپا آلو، آپا آلو'' کر کر کے اس کی جان کھا جاتا۔ کبھی کبھی زینب کو لگتا وہ خود بھی ایک طوطا ہے۔ وہ طوطا جو پنجرے میں بند ہوتا

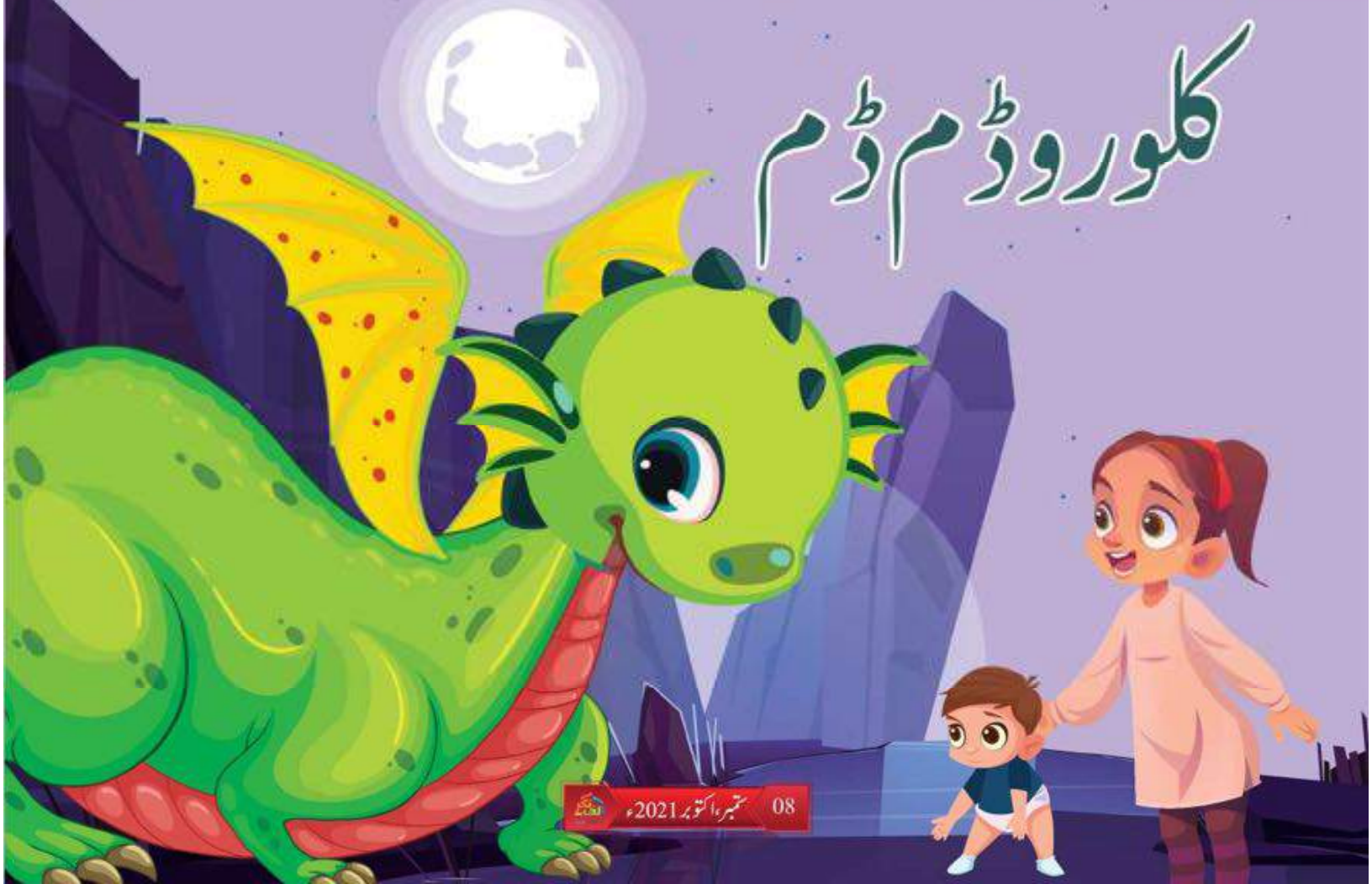

ہے اور بس وہی کہتا ہے جو دوسرے اس سے کہلوانا چاہتے ہیں۔ زینب کا دل چاہتا وہ کہیں چلی جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کتا، طوطا، بلیاں، مرغیاں اور منا نہ ہوں اور جہاں کوئی اس کی بات سننے والا ہو۔ اپنے گھر میں تو کسی کو فرصت نہیں تھی۔ پہلے ماما اور دادی سے اس کی دوستی تھی لیکن اب وہ دونوں بہت مصروف تھیں۔ پاپا اپنے بزنس کے ساتھ ساتھ ماما اور دادی کے پکائے کھانوں کی ڈیلیوری بھی کرتے تھے۔ رہے دادا ابو، تو ان کو اگر دنیا میں کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ ان کی بندوق تھی۔

دادا کو ساری زندگی شکار کا شوق رہا تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے وہ کتا پالتے تھے تاکہ اس کی مدد سے شکار کیا کریں۔ یہ اور بات کہ ساری زندگی سوائے دو چار بٹیروں کے کوئی شکار نہ کر سکے۔ اب ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور شکار کا شوق چھرے والی بندوق سے چھپکلیاں مار کر پورا کیا کرتے تھے۔ چھپکلیاں تو نہ مرتیں بلکہ بھاگ جاتی تھیں، البتہ سارے گھر کی دیواروں پر چھروں سے سوراخ ہو چکے تھے۔ جب کبھی شکاری دادا ابو چھپکلیوں کا شکار کرتے اور بندوق کی دھائیں دھائیں سے دادی کا دل دہل جاتا تو وہ خفا ہو جاتیں، ارے جھاڑو سے مر جائیں گی چھپکلیاں۔ چھرے کیوں مارتے ہو؟'' دادا سنی ان سنی کر دیتے اور ان کی بندوق دھائیں دھائیں چلتی رہتی۔ دادی خفا ہو کر بڑبڑاتیں، سٹھیا گئے ہیں بڑے میاں۔'' ایک دن زینب نے پوچھا: ''سٹھیا گئے کا کیا مطلب دادی امی؟''

دادی بولیں۔ ''مطلب یہ کہ دماغ پہلے جیسا نہیں رہا۔ کسی کی سنتے نہیں، مانتے نہیں۔''

زینب بولی۔ ''پھر تو منا بھی سٹھیا گیا ہے۔ بلکہ وہ تو پیدا ہی سٹھیایا ہوا ہوا تھا۔''

لیکن پھر اسے خود پر بہت شرم آئی۔ بھلا بڑوں اور بچوں کے بارے میں کوئی ایسے کہتا ہے؟

ایک دن ایک عجیب و غریب چھپکلی کہیں سے آ نکلی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں تھیں جن سے وہ سب کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دم سبز رنگ کی تھی جس پر کانٹے سے اگے تھے۔ شکاری دادا ابو کی نظر اس پر پڑی تو چلا اٹھے، ''میری بندوق لاؤ۔''

یہ کہہ کر اٹھے اور بھاگ کر اپنے کمرے کو گئے تاکہ بندوق لائیں اور چھپکلی ماریں۔ دادی نے بندوق کا نام سنا تو گھبرا کر جوتا اتارا اور چھپکلی کو کھینچ مارا۔ جوتا نشانے پر لگا اور چھپکلی کی سبز دم کا ذرا سا حصہ کٹ کر فرش پر گر پڑا۔ چھپکلی تیزی سے دوڑتی ہوئی کھڑکی کے سوراخ سے باہر نکل گئی۔ اس رات زینب اپنے کمرے میں منے کے ساتھ سو رہی تھی کہ اس کی آنکھ ایک عجیب سی آواز سے کھلی۔ دھپ دھپ دھپ جیسے کوئی نرم سی چیز زمین پر پٹخی جا رہی ہو۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ لان میں جھبرو کچھ گھسیٹ رہا ہے، لیکن یہ آواز چھت سے آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک زینب یہ آوازیں سنتی رہی پھر اسے نیند آ گئی۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ چھت پر سینکڑوں بندر اچھل کود کر رہے ہیں۔ بوڑھے بندر، جوان بندر، ننھے منے بندر۔ ان کے درمیان منا بھی ہے۔ بندر منے کو ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے ہیں اور زینب اسے بچانے کے لیے کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف بھاگتی پھر رہی ہے۔ پھر ایک اڑن طشتری آسمان سے اتری اور بندروں اور منے، سب کو اٹھا کر لے گئی۔ زینب چھت پر اکیلی کھڑی رہ گئی۔ گھبرا کر زینب کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا منا اٹھ چکا تھا اور کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زینب نے جلدی سے اسے گود میں اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی آئی۔ چھت پر اس نے جو کچھ دیکھا اس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ وہاں نہ بندر تھے نہ اڑن طشتری۔ چھت پر ایک ڈریگن بیٹھا تھا۔

سبز رنگ کا ایک بڑا سا ڈریگن جس کے پر سنہری تھے، آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور جس کی سبز دم پر بڑے بڑے کانٹے سے اگے تھے۔ زینب نے دیکھا اس کی دم کا ایک ذرا سا حصہ غائب تھا۔ پتا نہیں کیسے لیکن زینب جان گئی کہ یہ وہی چھپکلی تھی جسے دادی نے جوتے سے مارا تھا۔ وہ چھپکلی اب ایک بڑا سا ڈریگن بن چکی تھی اور ان کی چھت پر بیٹھی تھی۔

منے نے ڈریگن دیکھا تو خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ ڈریگن کی طرف اشارہ کر کے بولا، ''آپا، آلو۔''

ڈریگن نے گردن موڑ کر اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے زینب اور منے کو دیکھا اور آہستہ سے بولا، ''کلوروڈم ڈم۔'' اس کی آواز صاف اور نرم تھی۔ زینب کے دل سے ڈر نکل گیا اور وہ دو قدم بڑھ کر ڈریگن کے نزدیک آ گئی۔ ڈریگن نے اپنی سبز دم اٹھا کر زینب کو دکھائی اور اداسی سے بولا، ''کلوروڈم ڈم۔''

پھر اپنے پر اٹھائے اور مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ زینب سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کی دم زخمی تھی اور وہ اڑ نہیں سکتا تھا۔ یعنی اب وہ ڈریگن انہی کی چھت پر رہنے والا تھا۔ مطلب یہ کہ کتے، طوطے، مرغیوں اور منے کے ساتھ ساتھ اب زینب کو ڈریگن کی فکر بھی کرنی تھی۔ زینب بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور کچن میں جا پہنچی۔ وہاں ماما اور دادی کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ پاپا ناشتا کر رہے تھے۔ زینب نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا: ''ماما، پاپا ہماری چھت پر ایک ڈریگن بیٹھا ہے۔''

لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ سنی بھی تو یقین نہ کیا۔ دادا ابو کو وہ اس لیے نہ بتانا چاہتی تھی کہ کہیں بندوق لے کر ڈریگن کو مارنے نہ چل پڑیں۔ فکر کے مارے زینب کی بھوک اڑ گئی۔ وہ ڈریگن کا خیال کیسے رکھے گی؟ اسے کیا کھلائے گی؟ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ڈریگن کھاتے کیا ہیں۔ اس نے اپنی کتابوں میں دیکھا، نیٹ پر ڈھونڈا، لیکن کہیں بھی اسے ڈریگن پالنے کے بارے میں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ حیران پریشان سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ماما کی آواز آئی: ''زینب منے کو پکڑو۔'' زینب نے دیکھا منا پھر سبزی کی ٹوکری میں گھسا بیٹھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں آلو تھے۔ زینب نے اسے اٹھایا اور چھت پر آ گئی۔ وہاں ڈریگن ویسے ہی موجود تھا۔

منے نے کھلکھلا کر ہاتھ بڑھائے اور ڈریگن سے بولا، ''آپا..... آلو۔'' ڈریگن نے منہ

کھولا اور لپک کر دونوں آلو کھا گیا۔ پھر وہ خوشی سے جھوم کر بولا، ''کلوروڈم ڈم۔'' یوں ڈریگن وہاں رہنے لگا اور زینب اور منے کا دوست بن گیا۔ وہ تین تین آلو صبح شام کھاتا تھا اور ایک ہی بات کہتا تھا، کلوروڈم ڈم۔ زینب اور منے کا زیادہ وقت چھت پر گزرنے لگا۔ سردیوں کے دن تھے اور چھت پر دھوپ اچھی لگتی تھی۔ زینب نے کہیں سے ایک پرانے کمبل کا بندوبست بھی کر لیا جو ڈریگن رات کو اوپر لے کر سو سکتا تھا۔ وہ دادی کی دوائیوں میں سے ایک کریم بھی مانگ لائی جو وہ صبح شام ڈریگن کی زخمی دم پر لگاتی تھی۔ ڈریگن کا زخم بھرنے لگا لیکن وہ ابھی بھی اڑ نہ سکتا تھا۔ وہ سارا دن دھوپ میں بیٹھا رہتا اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے زینب اور منے کو دیکھتا رہتا۔ منا اس کی پیٹھ پر چڑھ جاتا، اس کی گردن سے جھول جاتا اور اس کی دم سے لٹک جاتا۔ اور اگر یوں چڑھتے اترتے وہ گرنے لگتا تو ڈریگن اپنے پر پھیلا دیتا اور بڑے آرام سے منے کو کیچ کر لیتا۔ منا ڈریگن سے کھیلتا رہتا اور زینب کو اتنا وقت مل جاتا کہ کوئی کہانیوں کی کتاب پڑھ لے یا گڑیوں سے کھیل لے۔ وہ ڈریگن سے اپنے دل کی ہر بات کرنے لگی تھی۔ اس نے ڈریگن کو جھبرو کی، طوطے کی، مرغیوں کی اور منے کی ہر بات بتائی تھی۔ ڈریگن نے نہ تو اسے کوئی نصیحت کی تھی نہ کوئی اور بات کہی تھی۔ بس پیار سے اپنا پر اس کے کندھوں پر پھیلایا تھا اور نرمی سے کہا تھا، ''کلوروڈم ڈم۔'' کچھ شرماتے، کچھ گھبراتے زینب نے اسے یہ بھی بتایا تھا: ''کہ دادا ابو ٹھیا گئے تھے اور منا پیدا ہی ٹھیا یا ہوا تھا۔''

ڈریگن سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے غور سے زینب کو دیکھا تھا اور پوچھا تھا، ''کلوروڈم ڈم؟''

''نہیں'' زینب نے کہا ''میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔''

اب جبکہ اُس کی بات سننے کے لیے ڈریگن موجود تھا اور منا بھی خود سے کھیلنے لگا تھا، اسے غصہ آنا کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ گھر والے جیسے بھی ہوں، اپنے ہوتے ہیں اور اپنوں کو ان کی خامیوں کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاتا۔

ڈریگن کی کٹی ہوئی دم دوبارہ اگنے لگی تھی۔ وہ ہر روز اپنی دم کا جائزہ لیتا اور امید بھری آواز میں کہتا، کلوروڈم ڈم۔ زینب جانتی تھی کہ جب اس کی دم پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو وہ اڑنے کے قابل ہو جائے گا۔ پھر وہ چلا جائے گا۔ یہ سوچ کر زینب اداس ہو جاتی تھی۔ ایک دن اس نے دیکھا، پاپا پریشان بیٹھے تھے۔ دادی ان سے کہہ رہی تھیں، ''بیٹا مشکل وقت گزر جاتا ہے۔ ہمت سے، صبر سے اور محنت سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ تم پریشان نہ ہو میرے بچے۔ یہ مشکل وقت گزر جائے گا۔ اچھا وقت ضرور آئے گا۔''

زینب کو ڈریگن کا خیال آیا۔ اس نے بھی تو اپنا مشکل وقت حوصلے سے گزارا تھا اور بڑے صبر سے اپنی دم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس مشکل وقت میں اس نے نہ تو کسی پر غصہ کیا تھا نہ بے وقوفوں کی طرح اڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے یہ وقت سکون سے گزارا تھا اور زینب اور منے کے لیے دوستی، ہمدردی اور پیار کا سہارا بنا تھا۔

زینب نے صاف اور مضبوط آواز میں دادی سے کہا:

''میں طوطا نہیں بننا چاہتی، جو بے وقوف ہے اور خوامخواہ شور مچاتا رہتا ہے۔ میں ڈریگن بننا چاہتی ہوں۔ سٹرانگ اور عقل مند۔ ویسا ڈریگن جو ہماری چھت پر رہتا ہے۔''

پاس بیٹھے دادا چونک گئے۔ اچھل کر بولے، ''ڈریگن؟ چھت پر؟ کب؟ کیسے؟''

یہ کہہ کر اچھل کر اٹھے اور دوڑ کر کمرے سے بندوق اٹھا لائے۔ زینب گھبرا کر چلائی، ''دادا ابو میرے ڈریگن کو نہ ماریئے گا۔'' لیکن دادا ابو کہاں سنتے تھے۔ انہوں نے بندوق لوڈ کی اور بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گئے۔ زینب گھبرا کر پیچھے بھاگی۔ دادا ابو چھت پر پہنچے تو سچ مچ کا ڈریگن دیکھ کر اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈریگن نے ایک نظر دادا ابو کو دیکھا، پھر ان کے پیچھے کھڑی گھبرائی ہوئی زینب کو اور وہ سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اپنے پر پھیلائے۔ دادا ابو نے بندوق سیدھی کی۔ ڈریگن نے دم کو فرش پر پٹخا اور جست لگائی۔ دادا ابو نے دھائیں سے گولی چلا دی۔

ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ جب دھواں چھٹا تو زینب نے دیکھا کہ چھت خالی پڑی ہے اور دادا ابو حیران کھڑے ارد گرد دیکھ رہے ہیں۔ ڈریگن جا چکا تھا۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

آج ڈریگن کو گئے بہت دن گزر چکے ہیں۔ دادی نے ٹھیک کہا تھا۔ مشکل وقت ہمت کرنے سے گزر جاتا اور اچھا وقت آ جاتا ہے۔ زینب کا مشکل وقت بھی گزر گیا ہے۔ دادی اور ماما کا بزنس اچھا چلنے لگا ہے۔ انہوں نے دو مددگار بھی رکھ لیے ہیں۔ زینب کا سکول کھل گیا ہے اور وہ روز سکول جاتی ہے۔ جھبرو، مرغیاں، طوطا اور منا اب زینب کی ذمہ داری نہیں رہے۔ اب اسے پھر سے منے پر پیار آنے لگا ہے۔

منے نے ایک نیا لفظ سیکھ لیا ہے، ''کولودم دم۔'' کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کیا مطلب ہے لیکن زینب جانتی ہے۔ ہر روز جب وہ سکول سے واپس آتی ہے تو امی دروازہ کھولتی ہیں۔ ان کی گود میں چڑھا ہوا منا لپک کر زینب کی گود میں آ جاتا ہے۔ پیار سے دونوں ہاتھ اس کے گالوں پر رکھتا اور پوچھتا ہے، ''آپا کولودم دم؟''

زینب اس کا منہ چوم لیتی ہے اور کہتی ہے، ''ہاں منے کولودم دم۔''

جھبرو آج بھی ویسا ہی ہائپر ہے۔ مرغیاں اتنی ہی احمق ہیں۔ بلیاں اتنی ہی مغرور ہیں اور طوطا اب بھی ویسا ہی کریک ہے۔ دادا ابو اب بھی بندوق سے چھپکلیاں مارتے پھرتے ہیں اور دادی اب بھی بڑبڑاتی رہتی ہیں، لیکن اب زینب خوش رہنے لگی ہے۔ اب وہ طوطا نہیں رہی، ڈریگن بن چکی ہے۔ اب اسے اپنا گھر چڑیا گھر نہیں لگتا۔ منا اب بھی زینب کے ساتھ سوتا ہے۔ کبھی سوتے میں زینب کو یوں لگتا ہے کسی نے آہستہ سے، پیار سے کہا ہو، ''کلوروڈم ڈم۔'' وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ کروٹ بدل لیتی ہے اور منے پر بازو رکھ کر سو جاتی ہے۔ کھڑکی کے سوراخ میں بیٹھی سبز دم والی چھپکلی اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہے اور مڑ کر واپس چلی جاتی ہے۔ ☆

ستمبر یاد رکھنا

محمد رمضان شاکر

گر وطن ہے آباد رکھنا
تو چھ ستمبر یاد رکھنا

یاد کر کے شہدا کی قربانی
دلوں کو اپنے شاد رکھنا

ہو جائے دشمن پاش پاش
زورِ بازو ایسا فولاد رکھنا

آ مل کر آج عہد کریں
وطن کو ہے آزاد رکھنا

ہونٹوں پہ ہر دم شاکر
نعرۂ وطن زندہ باد رکھنا

گر وطن ہے آباد رکھنا
تو چھ ستمبر یاد رکھنا

نورِ صبح

عائشہ اطہر

غلام رسول اپنی جماعت میں اوّل آیا ہے دادی جان خوشی، خوشی فضل دین کو بتا رہی تھی۔ ''غلام رسول! اپنا کپ دکھاؤ۔'' دادی جان کونے میں کپ ہاتھ میں لیے کھڑے غلام رسول سے مخاطب ہوئیں۔ اس سے پہلے کے غلام رسول کپ دکھانے آگے بڑھتا کھانے کا آخری نوالہ ختم کرتے ہی فضل دین وہاں سے یہ کہتا اُٹھ گیا۔

''مسلمی! پانچ سو روپے غلام رسول کو دے دو اس کا انعام۔'' کمرے میں موجود باقی سب بچے غلام رسول کی اس عزت افزائی پر منہ بچا کے مسکرا رہے تھے۔ غلام رسول کا چہرہ ایک ہی پل میں مرجھا گیا تھا۔ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی اُس کے ساتھ ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا تھا۔ سرخ سفید خوبصورت پانچ بہن، بھائیوں میں ایک وہ اکیلا ہی گہری رنگت والا تھا۔ گہری رنگت، روشن چمکتی ذہانت سے بھرپور آنکھیں کشادہ پیشانی لیکن وہ فضل دین کو نہیں بھاتا تھا۔ وہ دوسرے بچوں سے محبت کا برملا اظہار کرتے اُن کو پیار کرتے لیکن غلام رسول سے اُن کا رویہ بڑا سرد اور روکھا سا ہوتا تھا۔ امّی بھی اُن کے سامنے غلام رسول سے کم بات کرتی تھی۔ دادا جان اور دادی جان کے بار بار ٹوکنے پر بس اتنا فرق پڑا کے غلام رسول جس طرح بھاگ بھاگ کے اُن کے کام کرتا تھا تو وہ اُسے منع نہیں کرتے تھے۔

''غلام رسول، غلام رسول! اُٹھ جاؤ بیٹا! فجر پڑھ لو دادی جان بہت پیار سے غلام رسول کے کان کے قریب بول رہی تھی۔'' ہمیشہ کی طرح دوسری تیسری آواز پر غلام رسول اُٹھ گیا تھا۔ ''او جی اُٹھ گئے کیا۔''

''ہاں! وضو کر رہا ہے فضل دین۔'' دادی جان بتا کر قرآن پڑھنے لگی۔ غلام رسول دوڑتا ہوا باہر گیا اور تار پر سے خشک تولیہ اُتار کر صحن میں لگے نلکے سے وضو کرتے فضل دین کے پاس کھڑا ہو گیا۔ فضل دین نے وضو کیا ہمیشہ کی طرح روکھے سے لہجے میں غلام رسول کے سلام کا جواب دیا اور تولیہ پکڑ کر ہاتھ خشک کیے۔

''باقی سب کو بھی اُٹھا دو نماز کے لیے۔'' وہ غلام رسول کی امّی سے مخاطب تھے۔ غلام رسول نے نماز پڑھی قرآن پاک کی تلاوت کی اور اپنی کتاب لے کر چھت پر سبق یاد کرنے لگا جتنی دیر میں او جی نے نماز اور تلاوت سے فارغ ہوتا تھا اُتنی دیر اس نے اپنے سکول کے سبق دہرانے تھے۔ پھر وہ تب تک او جی کے اردگرد چکر لگاتا رہتا تھا۔ جب تک وہ اپنے کام کے لیے روانہ نہیں ہو جاتے تھے۔ کبھی گاڑی صاف کرتا، کبھی گرم چائے کا کپ لا کر اُن کے پاس رکھتا کبھی آملیٹ کبھی پراٹھا وہ باورچی خانے سے میز تک کے اَن گنت چکر لگاتا۔ وہ چھ فٹ اُونچے گورے چٹے باپ کی محبت میں بری طرح گرفتار تھا۔

''غلام رسول! میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔'' صائم نے ایک لفافہ اُس کی

جانب بڑھایا۔ صائم کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''اس میں کیا ہے؟'' غلام رسول نے دادی کی ٹانگیں دباتے اشتیاق سے پوچھا۔

''رنگ گورا کرنے کی کریم'' صائم نے جواب دیا۔

''رک ذرا! میں بھی تجھے تحفہ دوں'' دادی نے پاس پڑی چھڑی صائم کو مارنے کے لیے اُٹھائی۔ صائم قہقہے لگاتا کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

''میرے بچے! ان کی باتوں کو دل پر نہ لینا کم عقل ہیں۔ تمہارے دادا جان آج آجائیں تو ان کی خوب شامت بلواتی ہوں۔'' اُنہوں نے پیار سے غلام رسول سے کہا۔

دادا جان کے ساتھ روز صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد صبح کی سیر پر جانا غلام رسول کو بہت پسند تھا اُس دن بھی سیر کے لیے نکلے تھے کہ دو تین جنگی جہاز بہت تیزی سے اُن کے سروں کے اُوپر سے گزرے۔

''یہ جہاز ایسے! کیا جنگ ہونے لگی ہے'' غلام رسول نے دادا جان سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا جنگ نہیں آج چھ ستمبر ہے نا اور چھ ستمبر کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے کیسے ہمارے دشمن ملک بھارت نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں بغیر اطلاع کے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ دشمن پاکستان کو بہت آسان شکار سمجھ رہا تھا اور سوچ چکا تھا کہ ناشتہ تو وہ لاہور میں کریں گے لیکن ہماری بہادر قوم اور افواج پاکستان نے دشمن کو ایسا بھرپور جواب دیا کہ دشمن دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور دشمن آج بھی اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا ہے۔''

''پاک فوج زندہ باد'' غلام رسول نے نعرہ لگایا دادا جان غلام رسول کے پُرجوش نعرہ لگانے پر مسکرا اُٹھے۔ گھر واپس پہنچے تو فضل دین صائم کی کسی بات پر مسکرا رہے تھے اور اپنے ہاتھ سے پراٹھے کا نوالہ توڑ کر صائم کو کھلا رہے تھے۔ غلام رسول رک گیا تھا۔

''کیا کبھی ابو جی مجھے بھی ایسے کھلائیں گے؟'' معصوم ذہن میں سوال اُبھرا۔

''ہاتھ دھو آؤ غلام رسول سب ناشتہ کرتے ہیں۔'' دادا جان نے اُس کا کندھا تھپکا۔ غلام رسول جتنی دیر میں ہاتھ دھو کر آیا ابو جی میز سے اُٹھ چکے تھے۔

''دادی جان کیا گہری رنگت ہونا بہت بری بات ہے؟'' مسز چھیلتی دادی جان سے غلام رسول نے مدہم آواز میں پوچھا۔

''یہاں آؤ میرے بچے'' دادی جان نے غلام رسول کو اپنے قریب بٹھایا۔

''تم تو شہزادے ہو۔ حضرت بلالؓ کو جانتے ہو نا۔ سیاہ رنگت تھی اُن کی، آواز ایسی کے جب تک فجر کی آذان نہ دیتے سورج نہ نکلتا۔ عاشقِ رسول ﷺ تھے اور ہمارے نبی پاک ﷺ کتنی محبت کرتے تھے اُن سے اور میرے بچے! تم تو نبی پاک ﷺ کی نعت پڑھتے ہو تم سے پیارا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا'' دادی نے پیار سے بولتے ہوئے غلام رسول کا ماتھا چوما۔

''تمہارا باپ نادان ہے ہیرے کی پہچان نہیں اُس کو اُس کی باتوں کا برا نہ منایا کرو۔'' غلام رسول ہمیشہ کی طرح بہت دھیان سے دادی کی باتیں سن رہا تھا۔

ربیع الاوّل کا آغاز تھا اور ہمیشہ کی طرح سکول میں مقابلہ نعت خوانی منعقد کیا جا رہا تھا۔ مقابلے کی خاص بات یہ تھی کہ پورے پاکستان سے سکولوں کے بچے اس مقابلے میں شریک ہونے کے لیے آ رہے تھے۔ اُن بچوں کے لیے ہاسٹل میں رہائش کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ملک کے نامور نعت خواں مصنفین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اپنے سکول کی طرف سے غلام رسول مقابلے میں شرکت کے لیے منتخب ہوا تھا اور دادا جان غلام رسول کے مقابلے میں منتخب ہونے پر سب بچوں کو جلیبیاں کھلا رہے تھے، جب صائم جلیبی کھاتے ہوئے بولا:

''دادا جان! کیا غلام رسول یہ مقابلہ جیت جائے گا؟''

''انشاءاللہ! ضرور جیتے گا'' دادا جان نے جواب دیا۔

''پورے پاکستان سے آ رہے ہیں نعت خواں اور غلام رسول تو سیکھا ہوا بھی نہیں۔'' نازو جو غلام رسول سے چھوٹی تھی فکرمندی سے بولی۔

''نعت پڑھنے کے لیے سیکھنا ضروری نہیں ہوتے نبی ﷺ سے عشق ضروری ہے اور وہ میرے غلام رسول کو بہت ہے'' دادا جان نے جلیبی کا ایک ٹکڑا غلام رسول کے منہ میں ڈالا۔ اسی وقت فضل دین کمرے میں داخل ہوا۔ لو بھئی فضل دین! مبارک ہو غلام رسول سکول کی طرف سے نعت کے مقابلے کے لیے منتخب ہو گیا ہے'' دادا جان نے فضل دین کو خوشخبری سنائی۔

''کون سا بڑا معرکہ مار لیا ہے؟'' پڑھائی پر توجہ دے اس سال بورڈ کے امتحان ہیں اس کے۔'' فضل دین ناگواری سے بولے۔ دادا جان نے افسوس بھرے انداز میں فضل دین کو دیکھا جلیبیوں کی پلیٹ نازو کو پکڑائی اور کمرے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ یہ اُن کی ناراضگی کا اظہار تھا جسے فضل دین اچھی طرح سمجھتا تھا۔

سکول میں خوب رونق تھی۔ پورے سکول کو جھنڈیوں اور رنگ برنگی لائٹوں سے سجایا گیا تھا۔ دوسرے شہروں سے آنے والے طالبعلموں اور اُن کے ساتھ آئے اساتذہ کی رہائش کا انتظام ہاسٹل میں کیا گیا تھا۔ سب جوش و خروش سے نا صرف اپنے سکول کو سجا رہے تھے بلکہ ہر گلی ہر گھر سجا ہوا تھا۔ پورا شہر ہی کسی دُلہن کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا۔

غلام رسول دادا جان کے پاس بیٹھا نعت سُنا رہا تھا جب اُس کی امی کمرے میں داخل ہوئی۔

''غلام رسول اپنے ابو کو بتا دیا تھا کہ سکول والوں نے نعت خوانی کے لیے گھر سے دو افراد کو شریک ہونے کے لیے کہا ہے؟''

''نہیں امی! مجھے یاد ہی نہیں رہا'' غلام رسول بولا۔

''میرا بیگ تیار کر دو وہاں ملتان فیکٹری میں کچھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ گاڑی بھی خراب ہے بس سے جانا پڑے گا'' فضل دین اپنی بیوی سے مخاطب تھے۔

''ابو جی! کل میرا نعت کا مقابلہ ہے۔ سکول والوں نے گھر سے والدین کو بھی ساتھ لانے کا کہا ہے۔ غلام رسول باپ سے مخاطب تھا۔''

''نعت کا مقابلہ ہی ہے۔ تم کون سا دنیا فتح کرنے جا رہے ہو؟ اتنا ضروری کام چھوڑ کر تمہارے اس مقابلے کے لیے رک جاؤں؟'' دماغ ٹھیک ہے۔ فضل دین انتہائی غصے سے بولا۔

''بیٹا! ایک دن رک جاؤ بچہ خوش ہو جائے گا۔'' دادی جان نے فضل دین سے کہا۔

''نہیں رک سکتا ماں جی! لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔'' فضل دین جواب دے کر اپنا بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا جو اس ساری بحث کے دوران غلام رسول کی والدہ نے تیار کر کے اُن کے پاس رکھ دیا تھا۔

''اجازت دیں ماں جی!'' فضل دین نے ماں کے سامنے سر جھکایا۔

''خیر سے جاؤ خیر سے آؤ'' دادی جان نے فضل دین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ افسردگی اُن کی آواز سے عیاں تھی۔

مقابلے کا دن آن پہنچا تھا۔ موسم صبح سے ہی بے حد خوشگوار تھا۔ چاروں جانب کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سکول کے وسیع گراؤنڈ میں فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سٹیج بھی بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ملک کے مشہور نعت خواں بصیرت قاسمی، فرقان قادری اور شریف ہمدانی منصفین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ منصفین کے آتے ہی مقابلے کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ ملک کے کونے کونے سے آئے نعت خوانوں نے اپنی پرسوز آواز میں سماں باندھ دیا۔ پہلے راؤنڈ میں تیس نعت خوانوں میں سے پندرہ نعت خواں منتخب ہوئے۔ اور اُن پندرہ نعت خوانوں میں غلام رسول بھی شامل تھا۔ دادا اور دادی بہت خوش تھے۔ دادا آہستہ آواز میں غلام رسول کو سمجھا رہے تھے کہ اگلی نعت کون سی پڑھنی ہے اُسی وقت اعلان ہوا، غلام رسول کو نعت پڑھنے کے لیے سٹیج پر پکارا گیا۔ غلام رسول نے نعت پڑھنی شروع کی:

کاش میں دور ہیبر میں اُٹھایا جاتا
باخدا قدموں میں سرکار کے پایا جاتا

ریت کے ذروں میں اللہ بدل دیتا مجھے
پھر مجھے راہِ محمد ﷺ میں بچھایا جاتا

خاک ہو جاتا میں سرکار کے قدموں کے تلے
خاک کو خاکِ مدینہ میں ملایا جاتا

غلام رسول کی پرسوز آواز چاروں جانب گونج رہی تھی نہ جانے اُس کی آواز میں ایسا کیا تھا کہ محفل میں موجود ہر آنکھ نم تھی۔ نعت کا مقابلہ، مقابلہ نہیں رہا تھا بلکہ محبت و عقیدت کا ایک تحفہ بن گیا تھا جو نبی پاک ﷺ کے حضور پیش ہو رہا تھا۔ غلام رسول نے اتنی محبت اور جذب سے نعت پڑھی کے ججز کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اول انعام کا حقدار غلام رسول قرار پایا تھا۔ شریف ہمدانی صاحب نے اپنی طرف سے پانچ ہزار روپے نقد انعام غلام رسول کو تھمایا۔ سٹیج پر فرقان قادری صاحب نے سب بچوں کی تعریف کی اور کہا:

''نعت پڑھنا کوئی عام بات نہیں یہ تو عطا ہے جو قسمت والوں کو ہوتی ہے آپ سب بہت خاص بچے ہیں۔ اور خاص طور پر غلام رسول اس پر اللہ کا خاص کرم ہے جو اس کو اتنی پیاری آواز سے نوازا۔ غلام رسول کی آواز تو ایسی ہے جیسے ''صبح کا نور'' اور ہم سب ججز نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ غلام رسول کی آواز کو ''نورِ صبح'' کا خطاب دیا جائے۔'' دادا جان اور دادی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

کسی نے غلام رسول کی نعت کی ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دی اور ویڈیو رات و رات وائرل ہو گئی تھی۔ دو چار دن میں ہی غلام رسول کی نعت کی ویڈیو کے ہزاروں ویوز تھے۔

مارننگ شو والے تو ہمیشہ سے ہی ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نویں جماعت کا غلام رسول ذہانت سے بھرپور روشن چمکتی آنکھوں کے ساتھ میزبان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''کیسے شوق پیدا ہوا نعت پڑھنے کا؟'' میزبان نے سوال کیا۔

''میرے ابو جی نعت بہت ہی اچھی پڑھتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر شوق پیدا ہوا اور میرے دادا جان اور دادی جان بہت شوق سے میری نعتیں سنتے ہیں۔''

''غلام رسول آگے زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میزبان نے دوبارہ سوال کیا۔

''میں ایک باعمل مسلمان بننا چاہتا ہوں۔'' پورے اعتماد سے غلام رسول نے جواب دیا۔

''باعمل مسلمان! وہ کیسے؟'' میزبان حیرانی سے بولی۔

''اگر ہم پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے آخری خطبے ''خطبہ حجۃ الوداع'' کو اپنی زندگیوں میں پوری طرح داخل کر لیں تو کوئی ہمیں باعمل مسلمان بننے سے نہیں روک سکتا۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ:

''اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ آگاہ رہو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔''

(مسند احمد، حدیث نمبر 22391)

ملتان سے واپسی پر بس میں بیٹھے فضل دین نے ایک ایک لفظ غور سے سنا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے بزرگ اپنے سیل فون پر سارا پروگرام دیکھ رہے تھے۔

''نیک والدین کی اولاد ہے۔ کیا اچھی تربیت کی ہے۔'' بزرگ بول رہے تھے اور فضل دین کی آنکھوں سے آنسوں رواں تھے دکھ کے، ندامت کے، پچھتاوے کے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس خطبے کو سمجھنے میں اُس نے پچاس سال لگا دیے اُس کا بیٹا صرف تیرہ سال کی عمر میں اُس خطبے کو سمجھ کر دین کی روح کو پا گیا تھا۔ ندامت کے آنسو رواں تھے۔ لیکن وہ خوش تھا کیونکہ اس کے گھر میں چاروں جانب نورِ صبح تھی۔ ☆

رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

حمیرا اللہ یار

رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجودِ مبارک تمام عالمین کے لئے سراپا رحمت ہی رحمت ہے۔ یہ لقب اور شرف ایسا ہے جو کسی اور کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ عزوجل کے تمام انبیا و مرسلین رحمت تھے، مگر رحمت للعالمین نہیں تھے۔ ان سب کی شانِ رحمت اپنی قوم، اپنے علاقے، اپنے دور اور اپنے زمانے تک محدود تھی، جب کہ محسنِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت و شفقت کے دائرہ میں ہر عہد، ہر زمانے، ہر قوم، اپنے پرائے، کائنات اور مخلوقات یہاں تک کہ تمام جہان شامل ہیں۔

آج کے اس بے رحم، خود غرض معاشرے میں ان صفات کو جاننے اور اپنانے کی ضرورت ہے جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت للعالمین قرار دیا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوست، دشمن، اپنا، پرایا، عورت، مرد، بوڑھے بچے، کافر، مسلم، آقا و غلام، انسان، حیوان، کائنات اور تمام جہانوں کا ذرہ ذرہ ہر ایک کے لیے مجسمِ شفقت و محبت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ رحمت تمام عالمین، تمام جہانوں اور ہر عہد کے لیے ہے۔

رحمت للعالمین وہ ہیں جنہوں نے تمام بنی نوع انسان کو انسانی، قومی، قانونی اور مالی مساوات کا درس دیا جنہوں نے یہودیوں، عیسائیوں، منافقین اور تمام مخالفین کے ساتھ بے نظیر رواداری اور عدل و انصاف کا معاملہ کیا اور ان کے ہر طرح کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دی اور انسانوں کے تمام طبقات، امیر و غریب، عوام و خواص، بوڑھوں، بچوں، جوانوں، مردوں عورتوں، نیک و بد، محنت کشوں، مزدوروں، غلاموں، کنیزوں کے ساتھ رواداری و غم گساری، مساوات ہمدردی کے جذبات سے معاشرے کو آراستہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو اور دیگر حقوقِ انسانی کی حفاظت میں مسلمانوں کے ہم پلہ اور مساوی قرار دیا ہے۔

رحمت اللعالمین وہ عظیم ترین شخصیت ہیں جنہوں نے امنِ عالم کے قیام و استحکام کے لیے ساری زندگی صرف کی ہو، جنہوں نے بندوں کو اللہ سے ملایا ہو اور غریبی و امیری، جوانی و پیری، امن اور جنگ، رنج و راحت، ہر موقع اور ہر مقام پر انسانیت کی راہ نمائی کی۔ جن کی تعلیم نے تمام افرادِ بشر کو بھائی بھائی قرار دیا اور جانی دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔

کفار و مشرکین نے مکہ مکرمہ میں وہ کون سا ظلم تھا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے ساتھ روا نہ رکھا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پتھروں کی بارش کی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گلا گھونٹا گیا، نماز کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے منصوبے تیار کیے گئے، تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محصور رکھا گیا، جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارا کرنے کی نوبت آئی، طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت اذیت پہنچائی گئی۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا زدوکوب کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون و اطمینان سے رہنے نہیں دیا گیا۔ اسیرانِ بدر میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو عام مجمع میں ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اشتعال انگیز اور گستاخانہ تقریریں کیا کرتا تھا قیدی بن کر آنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے تاکہ یہ آپ کی شان میں گستاخانہ تقریر نہ کر سکے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگرچہ میں نبی ہوں لیکن پھر بھی اگر کسی کا عضو بیکار کر دوں گا تو اس کے لیے روزِ قیامت جواب دہ ہوں گا۔'' آپ نے سہیل بن عمر کے لیے تمام قیدیوں کی طرح معافی کا اعلان فرمایا۔

فتح مکہ کے موقع پر کفارِ مکہ کو موت اپنے سامنے نظر آ رہی تھی، انہیں خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! تمہیں کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟'' قریش کے لوگوں نے جواب دیا:

''ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' (زاد المعاد، ج:1 ص:4242)

آج دنیا میں موجود ناانصافی اور بدامنی سے بچاؤ کا واحد حل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان صفات کو اپنانے میں پوشیدہ ہے اور یہ کام ہم رحمت للعالمین کے جان نثاروں کو ہی شروع کرنا ہوگا۔ ☆

یوم دفاع نمبر

سُپر ہیرو

قرۃ العین خرم ہاشمی

بڑے سے ہال نما کمرے میں خاندان کے سب افراد جمع تھے۔ آج عید کا دوسرا دن تھا۔ ہمیشہ کی طرح دادا جان اظہر کیانی کے گھر میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں خاندان کے سب قریبی لوگ، خاص کر ان کے تینوں بیٹے اور بیٹیاں مع اہل وعیال شامل ہوتے تھے۔ سال میں چند ایک بار ہی تو سب فراغت سے عید کے موقع پر جمع ہوتے، آپس میں ہونے والی باتیں، چھوٹے چھوٹے شکوے شکایتیں، ہنسی مذاق، مستقبل کے منصوبے ایک عام سی محفل میں ہر رنگ، ہر ذائقہ شامل ہوتا تھا۔ ابھی بھی میٹھے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتوں کا رخ بچوں کی تعلیم اور مستقبل کی طرف مڑ گیا۔ چونکہ یہاں ہر عمر کے بچے موجود تھے، اس لیے سب کے منصوبے اور مستقبل کے ارادے الگ الگ تھے۔

''میں بڑا ہو کر ایرونائیکل انجینئر بنوں گا۔'' عفان نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بیٹا جی! اس کے لیے پڑھنا پڑتا ہے جبکہ آپ کو کرکٹ کھیلنے سے فرصت ہی نہیں۔'' تیرہ سالہ عفان کی ممانے منہ بنا کر کہا تو سب ہنس پڑے۔

''بچے کی سوچ تو اچھی ہے اور ارادہ بلند! ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔'' اظہر کیانی نے نواسے کی طرف داری کی تھی۔

''شکریہ نانا جان۔'' عفان نے جلدی سے کہا تو سب ہنس پڑے۔

''میں تو ڈاکٹر ہی بنوں گی۔'' پندرہ سالہ زیمل نے کہا۔

''اور زیمل باجی کی آنکھوں پر اتنا بڑا چشمہ لگے گا۔'' بارہ سالہ ماحد نے بہن کا مذاق اڑایا، کیونکہ زیمل نظر کی کمزوری کی وجہ سے عینک استعمال کرتی تھی۔

''اچھا موٹو! تم خود کیا بنو گے؟ اپنے سپر ہیروز کی طرح نہ تو تم سمارٹ ہو اور نہ تمہارے پاس کوئی سپر پاور ہے۔''

زیمل نے چھوٹے بھائی کو گھورتے ہوئے کہا تو سب ماحد پر ہنسنے لگے جبکہ ماحد نے شرمندگی کی وجہ سے منہ چھپا لیا۔

''آپ سب کو پتا ہے کہ ماحد کو سپر ہیرو بننے کا بہت شوق ہے۔ یہ ہر وقت سپر ہیرو کی باتیں کرتا ہے، ان کی تصویریں، کارڈز جمع کرتا ہے، ان کی جیسی حرکتیں کرنے کی کوشش میں ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے اور.....'' زیمل بغیر رکے شروع ہوگئی۔ سب ماحد پر ہنسنے لگے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے جبکہ ماحد سر جھکائے بیٹھا تھا۔

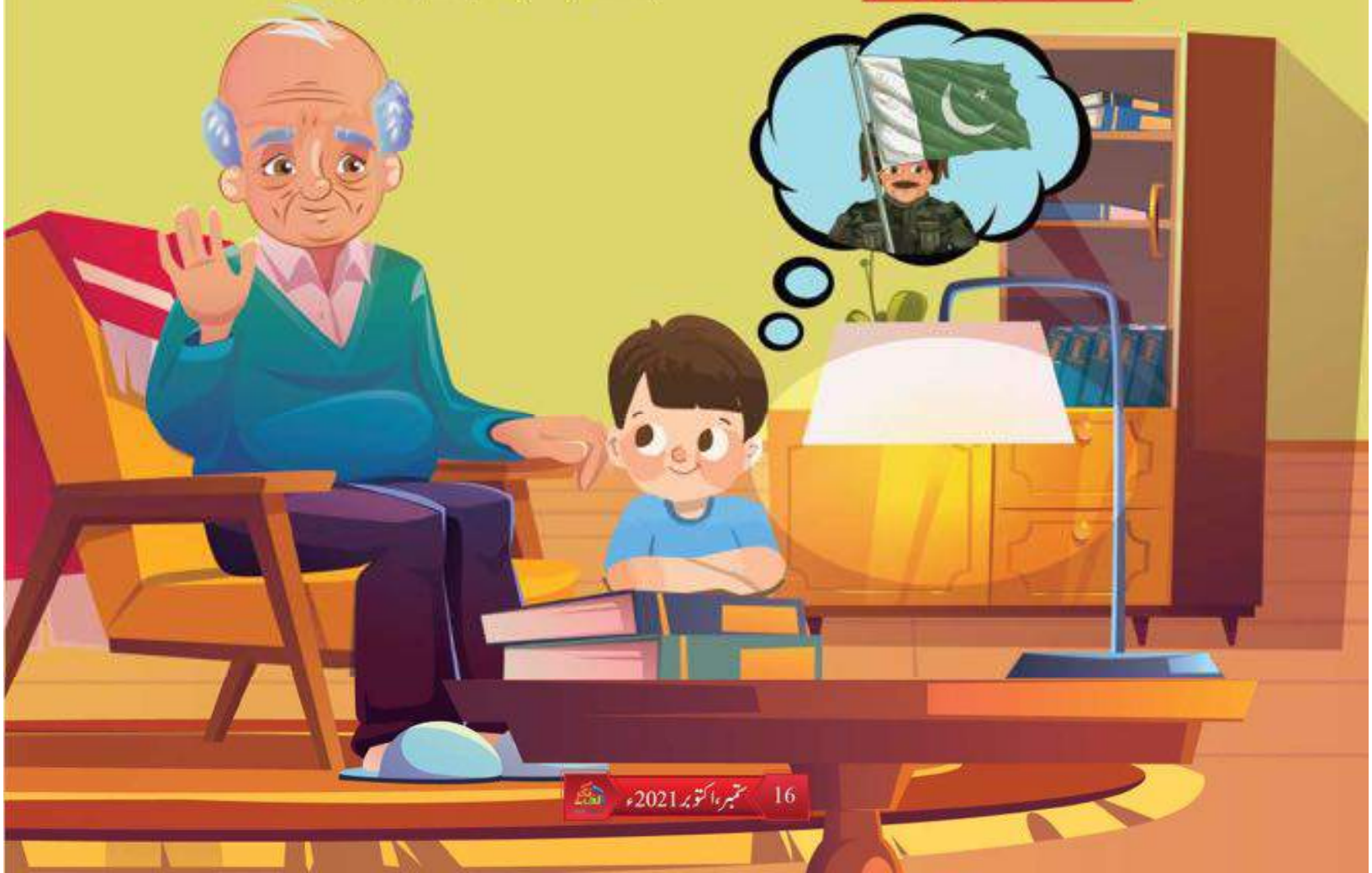

''زیمل بیٹی! بہت بری بات ہے۔ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے ہیں۔'' اظہر کیانی نے نرمی سے کہا تو ماحد نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''دادا جان! سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔''

ماحد نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ایک لمحے کے لیے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ ''زیمل ہمیشہ ماحد کو ایسے ہی ڈانٹتی ہے۔'' زیمل کی امی نے اسے گھورا تو اظہر کیانی نے ہاتھ اٹھا کر بڑی بہو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور مسکرا کر پوتی کی طرف دیکھا۔ ''بچو! آپ لوگ باتیں کریں میں ذرا ماحد میاں کو منا کر لاتا ہوں۔''

اظہر کیانی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ماحد بڑے سے لان میں بچھی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں نمی واضح تھی۔ اظہر کیانی پاس آ کر بیٹھ گئے تو ماحد نے سر اٹھا کر دادا جان کی طرف دیکھا۔

''میرا سپر ہیرو ناراض ہے؟'' اظہر کیانی نے محبت سے پوچھا۔

''دادا جان! کیا میں سپر ہیرو لگتا ہوں؟'' ماحد نے حیرانی سے سوال کیا۔

''سپر ہیرو لگنے سے زیادہ، ہونا ضروری ہوتا ہے اور تم سپر ہیرو بن سکتے ہو۔ اگر کوشش کرو۔'' اظہر کیانی نے نرمی سے کہا تو ماحد حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟ اتنے بے یقین کیوں ہو؟'' اظہر کیانی نے سوال کیا۔

''آپ بھی سب کی طرح میرا مذاق اڑا رہے ہیں نا۔'' ماحد نے اداسی سے کہا۔

''بالکل بھی نہیں! اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے سپر ہیرو کیسے ہوتے ہیں؟'' اظہر کیانی نے سوال کیا تو ماحد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''دادا جان! سپر ہیرو کیپٹن امریکا کی طرح ہوتا ہے، یا بیٹ مین یا سپر مین کی طرح۔ آئرن مین، اسپائڈر مین اور..... اور۔'' ماحد جوش جذبات میں سپر ہیروز کے نام گنوانے لگا تو اظہر کیانی ہنس پڑے۔

''بیٹا! اتنے سارے سپر ہیروز؟ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا ان سب میں ایک جیسی خوبیاں ہوتی ہیں؟'' اظہر کیانی سے سوال کیا تو ماحد نے نفی میں سر ہلایا۔

''سب کے پاس الگ الگ طاقت ہے جس کا استعمال وہ لوگوں کی مدد اور اپنے ملک کے لیے کرتے ہیں۔'' ماحد نے جلدی سے کہا تو اظہر کیانی نے سر ہلایا۔

''دادا جان! ماحد اپنا زیادہ وقت ان کی فلمیں دیکھنے میں ضائع کرتا ہے۔ اس لیے پڑھائی میں بھی کمزور ہو گیا ہے اور یہ دن رات سپر ہیروز کے خیالوں میں کھویا رہتا ہے۔ ایک بار تو اس نے اڑنے کی کوشش کی اور میز کے اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ شکر ہے بچت ہو گئی مگر یہ ایسی حرکتیں کر کے خود کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں اس لیے ماحد کے لیے فکر مند رہتی ہوں۔'' زیمل نے پاس آتے ہوئے فکر مندی سے کہا تو اظہر کیانی نے سر ہلایا۔

''زیمل آپی ہمیشہ میرے خلاف رہتی ہیں۔'' ماحد نے منہ بنا کر کہا تو زیمل نے پاس آ کر اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

''بے وقوف موٹو! تم میرے ایک ہی بھائی ہو۔ مجھے بہت عزیز ہو۔'' زیمل نے پیار سے کہا تو اظہر کیانی بے ساختہ مسکرا دیے۔

''ماحد بیٹا! زیمل بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے اور زیمل بیٹی ماحد بھی ٹھیک کہہ رہا ہے کہ سپر ہیروز ہوتے ہیں۔'' اظہر کیانی نے دونوں کی طرف داری کی۔

''وہ کیسے دادا جان؟'' زیمل نے حیرانی سے سوال کیا۔

''آؤ میرے ساتھ، میں بتاتا ہوں۔'' اظہر کیانی نے کہا اور پھر وہ سب واپس لاؤنج میں آ گئے۔ اظہر کیانی نے بڑے بیٹے کے کان میں کچھ کہا تو انھوں نے سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد اظہر کیانی کے بڑے بیٹے نے اپنے لیپ ٹاپ کو دیوار پر لگی بڑی سکرین سے منسلک کر دیا۔ اب لیپ ٹاپ پہ جو بھی لگتا، وہ آرام سے سکرین پر دیکھ سکتے تھے۔ لیپ ٹاپ اظہر کیانی کے کنٹرول میں تھا۔ سب لوگ حیرانی اور اشتیاق بھری نگاہوں سے سکرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اچھا! یہ بتائیں کہ یوم دفاع کے بارے میں آپ سب کیا جانتے ہیں؟'' اظہر کیانی نے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے سوال کیا۔ سب بچے ایک ساتھ بولنے لگے تو دادا جان نے انھیں ایک ایک کر کے بتانے کے لیے کہا۔

''اس دن انڈیا نے پاکستان پر حملہ کیا تھا۔'' ہر بچے نے ایک ہی طرح کا جواب دیا۔

''بالکل! انڈیا نے ہمیشہ کی طرح بزدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اچانک حملہ کر دیا۔ اس زعم میں کہ وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہے۔ جدید اسلحے سے لیس ہے مگر جانتے ہو کہ پھر ہوا کیا؟'' اظہر کیانی نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا دادا جان؟'' ماحد نے بے چینی سے سوال کیا۔

''پھر ہمارے سپر ہیروز نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ دشمن ہکا بکا رہ گیا۔'' اظہر کیانی نے کہا تو سب بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

''ہمارے پاس بھی سپر ہیروز ہیں؟'' ماحد نے حیرانی سے سوال کیا تو اظہر کیانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آج میں آپ کو تاریخ کے اصل ہیروز، ان کی مہارت، ذہانت، جرأت کے بارے میں بتاؤں گا۔ یہ دیکھو! یہ 6 ستمبر 1965ء کے وہ سپر ہیروز ہیں جن کی بہادری، ہمت نے دشمن کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کو دنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس سترہ روزہ جنگ میں ہمارے سپر ہیروز بہادری اور جرأت سے لڑے۔ ''ایم ایم عالم'' نے ایک منٹ کے اندر دشمن کے پانچ جہاز مار گرائے اور انھوں نے تقریباً نو جہاز تباہ کیے تھے۔ اب آپ سب خود بتائیں کہ کیا یہ سپر ہیروز سے کم ہیں؟'' اظہر کیانی نے سوال کیا تو سب نے نفی میں سر ہلایا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 65

ذرا سا پانی

سیدہ اقرا اعجاز

السلام علیکم امی! حور نے اسکول سے واپس آ کر گھر داخل ہوتے ہی امی کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' آج اسکول میں دن کیسا گزرا؟'' امی نے حور سے پوچھا۔

''کچھ نہ پوچھیں امی آج تو مس نے اتنا سارا کام کروایا۔ کھانے میں کیا بنایا ہے آپ نے؟'' حور نے امی سے پوچھا۔

''بیٹا میں نے آج آپ کی پسند کی بریانی بنائی ہے۔ آپ ہاتھ منہ دھولیں، پھر میں کھانا لگا دیتی ہوں۔'' حور نے اسکول بیگ صوفے پر رکھا اور ہاتھ دھونے چلی گئی۔ حور ہمیشہ کی طرح پورا نل کھول کر ہاتھ دھونے لگی۔ صابن سے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے بھی اس نے نل بند نہیں کیا۔

پانی مسلسل ضائع ہو رہا تھا۔ حور کی امی نے دیکھا تو بولیں۔

''بیٹا آپ کو اتنی بار کہا ہے کہ ہاتھوں پر صابن لگاتے وقت نل بند کر دیا کریں، لیکن آپ سنتی ہی نہیں ہیں۔ امی کی بات سن کر حور بولی۔

''امی اگر نل سے ''ذرا سا پانی'' ضائع ہو گیا تو کون سا ملک میں پانی کی قلت ہو جائے گی؟ ویسے بھی ٹینکی پوری بھری ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر حور کھانا کھانے ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئی۔ حور کی امی نے گرما گرم بریانی اور پانی کا گلاس لا کر ٹیبل پر رکھ دیا اور کسی کام سے کچن میں چلی گئیں۔ حور نے پانی پی کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔ ''اوہو! پانی تو گرم ہے۔''

ایسا کرتی ہوں یہ پانی سنک میں ''پھینک'' کر فریج سے ٹھنڈا پانی پی لیتی ہوں۔ یہ سوچ کر حور اٹھی اور کچن میں جا کر گلاس کا پانی سنک میں انڈیل دیا۔ حور کی امی نے اسے پانی پھینکتے دیکھا تو بولیں۔ ''بیٹا یہ تو میٹھا پانی تھا یہ آپ نے کیوں پھینک دیا؟''

''وہ امی پانی بہت گرم ہو رہا تھا اس لیے میں نے پھینک دیا۔'' حور کی بات سن کر امی بولیں۔ ''تو بیٹا آپ یہ پانی تھوڑی دیر فریج میں رکھ دیتیں ٹھنڈا ہو جاتا۔'' لیکن حور نے امی کی بات سنی ان سنی کر دی اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال ٹیبل پر کھانا کھانے لگی۔ حور کی امی اسے تاسف سے دیکھنے لگیں۔ کھانا کھانے کے بعد حور نے ہوم ورک کیا اور پھر کوئی کہانی کی کتاب پڑھنے لگی۔

.....☆.....

وہ ایک تپتا ہوا ریگستان تھا۔ سورج پوری شدت کے ساتھ آگ برسا رہا تھا۔ پسینے اور گرمی سے حور کا دم گھٹ رہا تھا۔ پیاس سے اس کا برا حال تھا، حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ ہونٹ بالکل خشک تھے اور ان پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرتی۔

اس وقت حور کی نگاہیں صرف ایک ہی چیز ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ تھا ''پانی۔'' لیکن اس تپتے ریگستان میں پانی کا ہونا ناممکن تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا کٹورا تو تھا لیکن خالی۔ وہ اس وقت کہیں سے پانی ملنے کی دعا کر رہی تھی۔ سخت گرمی اور پیاس کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پیروں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔

اچانک اسے سامنے سے ایک اونٹ آتا دکھائی دیا جس پر ایک آدمی سوار تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 41

وقت فجر

ایوب اختر

غائب ہوا ہے یکایک اندھیرا
پھیلا ہے چاروں طرف ہی سویرا

جاگے جو ابو تو سب کو جگایا
پڑھ لو فجر کہہ کے سب کو اٹھایا

مسجد کی جانب ہوئے وہ روانہ
پڑھتے جہاں تھے نمازیں روزانہ

سن کر اذان سعد بھیا بھی جاگے
پڑھ کر فجر سیر کرنے کو بھاگے

اب تک مگر زین سویا ہوا تھا
سپنوں کی دنیا میں کھویا ہوا تھا

ابو نے آتے ہی اس کو جھنجھوڑا
ہلکا سا کانوں کو اس کے مروڑا

اٹھ جا جلدی، یہ وقت دعا ہے
اس وقت سونا تمھاری خطا ہے

وقتِ فجر ایک رحمت ہے رب کی
ہم کو ملی ایک نعمت ہے رب کی

نادم ہوا زین اپنی خطا پر
خوش تھا ہدایت کی ایسی صدا پر

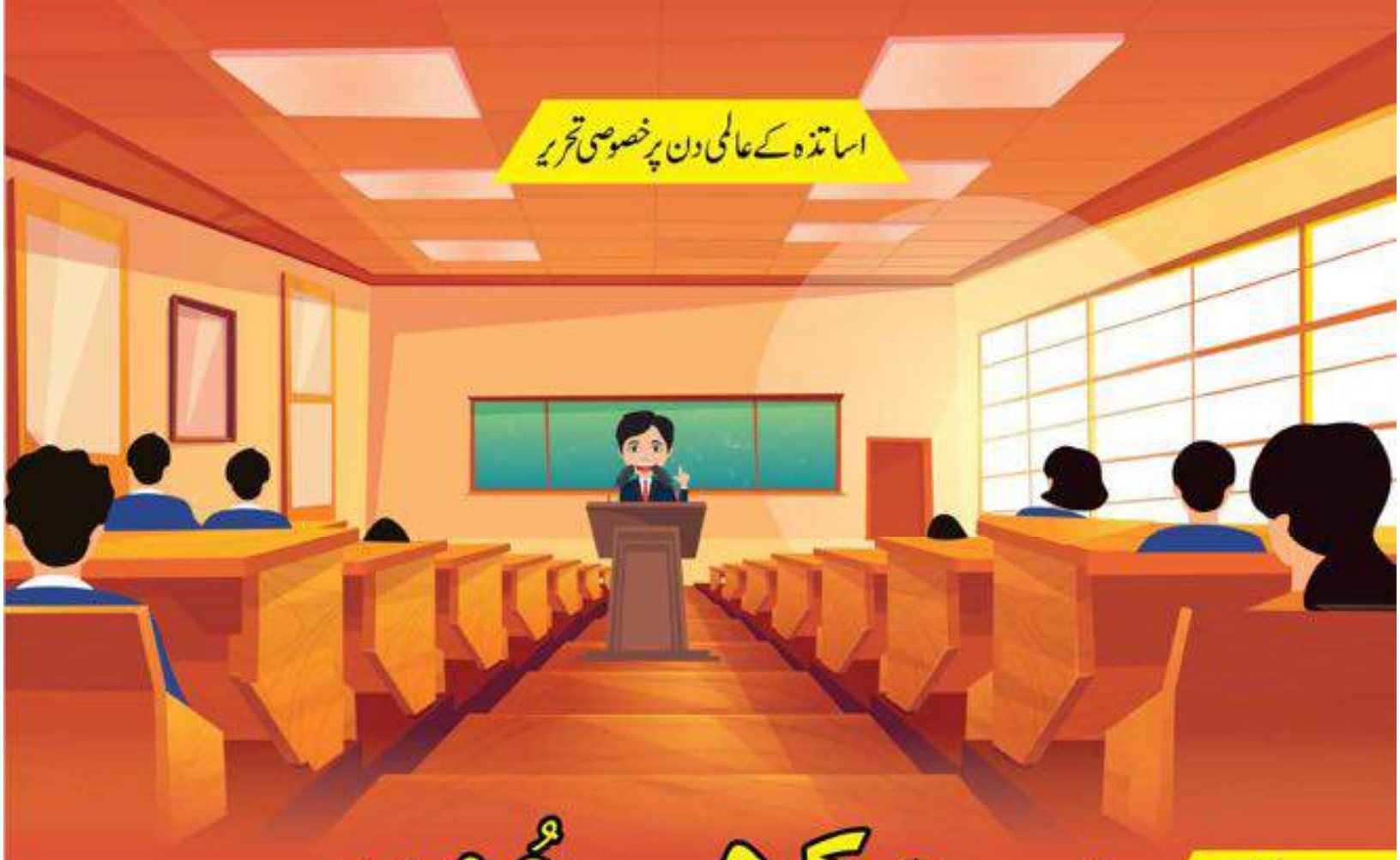

اساتذہ کے عالمی دن پر خصوصی تحریر

سرمکھی چُوس

روبینہ کبیر خان

''کسی بھی بچے کی ابتدائی زندگی میں جو اہم ترین مرد ہوتے ہیں ان میں سے ایک اُس کا والد ہوتا ہے اور دوسرا استاد۔'' ہزاروں کا مجمع اس وسیع آڈیٹوریم میں مشہور بزنس مین حیدر احتشام کی تقریر سُن رہا تھا حیدر نئی نسل کا ہیرو تھا۔ بہترین سپیکر جس نے بہت تھوڑے سرمائے سے شروع کیے کاروبار کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ اساتذہ کے بین الاقوامی دن پہ ایک مقامی تنظیم کی جانب سے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اس تقریب میں اسے مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

''میری زندگی میں بھی میرے والد اور استاد دو ایسے کردار رہے ہیں جن کی محنت کی وجہ سے آج میں یہاں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔'' آڈیٹوریم کے سامنے والی رو میں کچھ فاصلے سے احتشام صاحب اور سر توقیر بیٹھے تھے۔ ایک کی آنکھوں سے محبت اور انتہائی فخر کے جذبات چھلک رہے تھے اور دوسرے کے چہرے پر کچھ الجھن بھرے تاثرات تھے۔

دونوں پر گم صم انداز میں نظر ڈالتے حیدر جیسے بیس سال پہلے کے دور میں پہنچ گیا۔

''یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے سر۔ آپ ذرا دل کو سخت کریں تو ہر تین مہینے بعد ہمیں یہ مسئلہ نہ ہو''۔ اکاؤنٹس کے سر شکیل بے زاری سے پرنسپل صاحب کے سامنے بیٹھے اپنا رونا رو رہے تھے۔ پرنسپل صاحب اپنے ازلی اطمینان سے سامنے رکھی فائل پر دستخط کر رہے تھے۔ آفس کی پچھلی کھڑکی جس گلی میں کھلتی تھی۔ وہاں ایک پرانے درخت کے پیچھے بچے اکثر کھیلتے ہوئے چھپ جایا کرتے تھے اس وقت بھی اولیولز کا حیدر دوستوں کے ساتھ مذاق مذاق میں شرط لگا کے درخت کو ہاتھ لگانے دبے پاؤں وہاں سے گزر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر حیدر کے کانوں میں جو بات پڑی اس نے اس کی تمام تر توجہ کھینچ لی۔ اس کی ساری توجہ پرنسپل صاحب کے جواب پر تھی۔

''ہم استاد ہیں شکیل صاحب دُکاندار نہیں کہ پیسے نہ ہوں تو سودا نہیں ملے گا۔''

حیدر کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے، اندر آفس میں ہوتی گفتگو اسے اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بھی تو ان بچوں میں شامل تھا جو مالی مسائل کی وجہ سے وقت پر فیس ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ حیدر نے جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کے کچھ اور سُن گُن لینے کی کوشش کی۔

''آپ بھی اور سکولوں کی طرح ان بچوں کو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دیں تو آدھا مسئلہ تو ویسے ہی حل ہو جائے۔ سر شکیل واقعی تنگ آ چکے تھے۔

''آپ کا مطلب ہے جن بچوں کو دن رات سر اٹھا کے جینے کی تعلیم دیتا ہوں ان کی عزت نفس خود چکنا چور کر دوں؟'' پرنسپل صاحب نے خفگی سے سر شکیل کو دیکھا۔

''سر سکول بھی اب بزنس کے ادارے بن گئے ہیں اور بزنس ایسے نہیں چلتے۔''

''تو نہ چلیں۔'' پرنسپل صاحب نے دوٹوک انداز میں بات کاٹی۔

''اس اسکول میں کسی بچے کو فیس نہ دینے کی وجہ سے باقی بچوں سے الگ نہیں کیا جائے گا۔''

''مگر سر'' شکیل صاحب نے بے چارگی سے انہیں دیکھا۔ پرنسپل صاحب گہری سانس لے کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔''

''ویسے بھی او لیولز کے جن دو بچوں کا مسئلہ تھا ان کی فیس کے لیے سپانسر مل گیا ہے۔ ان کی CIE کی فیس ادا ہو جائے ہمارے سکول کی خیر ہے۔ دونوں بچے اچھا پڑھنے والے ہیں۔'' پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے پرنسپل صاحب تن کے کھڑے سامنے لگی قائداعظم کی تصویر کو ایک ٹک دیکھ رہے تھے باہر کھڑے حیدر کی جان میں جان آئی۔ او لیولز کے ان دو بچوں میں سے ایک وہ خود تھا۔ اس کے والد کا اچھا خاصا چلتا ہوا کاروبار پے در پے دھچکوں سے بہت برے حالات کا شکار تھا۔ اس کے والد تمام بلز پابندی سے وقت پر جمع کروانے کے عادی تھے بہت غیرت مند اور اونچی ناک والے احتشام صاحب نے پیسوں کے معاملے میں کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب جو حالات کی خرابی کی وجہ سے آمدنی گھٹی تو ہر چیز متاثر ہوئی۔

جیب میں پیسے ہی نہ تھے تو فیس کہاں سے جاتی۔ ان سارے چکروں میں حیدر کے نرم مزاج والد نہایت بدمزاج اور چڑچڑے ہو رہے تھے۔ گھر کا ماحول اتنا خراب ہو چکا تھا کہ حیدر کا سکول سے واپسی پر گھر لوٹنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ابھی صبح ہی سکول کے باہر ان کا سر توقیر سے کافی بڑا جھگڑا ہو گیا تھا۔ سکول کی بیل بجنے والی تھی۔ حیدر اور اس کے چھوٹے بہن بھائی لیٹ ہو رہے تھے۔ احتشام صاحب گاڑی چلانے کے دوران کسی سے موبائل فون پر بات کر رہے تھے۔ انہوں نے جلدی میں بغیر پیچھے دیکھے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ پیچھے سے آتے سر توقیر گاڑی کو روک نہیں پائے اور گاڑی احتشام صاحب کے دروازے میں ٹھونک دی۔ ایک تو ویسے ہی پریشانی کے دن اوپر سے گاڑی کے دروازے کا نیا خرچہ۔ احتشام صاحب اشتعال میں بالکل آپے سے باہر ہو گئے۔ مقابل سر توقیر تھے جنہیں لوگ عرف عام میں ''کنجوس مکھی چوس'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ سر مکھی چوس ایک عجیب و غریب کردار تھے، نہایت رُوکھے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے، بات کو کسی بھی مصلحت کے لیے شوگر کوٹ کرنا اُن کے اصول کے خلاف تھا۔ کڑوی سے کڑوی بات وہ مقابل کے منہ پر مارنے کے لیے مشہور تھے۔ اگر سکول میں غیر مقبول ہونے کا کوئی ایوارڈ دیا جاتا تو وہ سر توقیر کو بلا مقابلہ مل جاتا، مگر ان کی شہرت صرف ان باتوں کی وجہ سے نہیں تھی۔ ان کی اصل پہچان اور وجہ شہرت تھی ان کی حدوں کی چھوتی کنجوسی اگر وہ کسی غریب یا متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تو ان کی کنجوسی سمجھ بھی آتی مگر ان کا تعلق ایک صاحب حیثیت خاندان سے تھا موٹے موٹے عدسوں کی سستی ترین عینک، کاٹن کے سادہ شلوار قمیض میں ملبوس ایک پندرہ سال پرانی مہران جو چلتی کم تھی شور زیادہ مچاتی تھی اور جگہ جگہ سڑک پر رک جاتی تھی۔ سر توقیر کے ٹریڈ مارک تھے۔ جو لوگ ذاتی طور پر اُن کی زندگی سے واقف نہیں تھے ان کی حد سے بڑھی کفایت شعاری کا دل کھول کے مذاق اڑاتے انہیں قریب سے جاننے والوں کی تعداد بہت کم تھی سر توقیر عرف ''مکھی چوس'' اپنے بارے میں بات کرنے سے کتراتے تھے اور دوستیاں کرنا انہیں پسند نہیں تھا۔ ان کے واقف کار زیادہ تھے دوست بہت کم۔۔ حادثے کے وقت سکول کے گارڈز وغیرہ نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ سر توقیر تو غصے میں تھے ہی احتشام صاحب نے بھی ان کے ٹیچر ہونے کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ سارے سکول نے دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھا اور کئی دنوں تک مزے لے، لے کر تذکرہ بھی کیا۔

حیدر کے امتحان قریب تھے اس کی او لیولز کی فیس جا چکی تھی پوری کوشش کرنے کے باوجود احتشام صاحب کو آخر کار سکول سے مدد لینی پڑی۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ سپانسر کون ہے تاکہ وہ بعد میں ان کے پیسے لوٹا دیں مگر یہ سکول پالیسی کے خلاف تھا سو مجبوراً وہ خاموش ہو گئے۔

سر توقیر کے مضمون میں حیدر بری طرح فیل ہوا تھا۔ حیدر ایک اچھا طالب علم تھا۔ سارے سال کی ایوریج کو دیکھتے ہوئے اس کا رزلٹ بہت مایوس کن تھا۔ ذرا سہما حیدر رزلٹ لے کے جب گھر پہنچا تو اسے یقین تھا کہ باپ آج اس کی ہڈیاں توڑ دے گا۔ پہلے ہی حیدر کی فیس سپانسر شپ سے ادا ہونے پر ان کا موڈ کافی خراب تھا۔ حیدر کی توقع کے خلاف رزلٹ کارڈ دیکھ کے احتشام صاحب نے صرف اتنا پوچھا کہ اس کا پیپر کیسا ہوا تھا؟ حیدر نے کیا کہنا تھا سوائے اس کے کہ اچھا ہوا تھا۔ احتشام صاحب نے سکول فون کر کے اسی وقت پرنسپل صاحب سے میٹنگ کے لیے وقت لیا۔ پرنسپل صاحب سے میٹنگ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ انہوں نے احتشام صاحب کی سر توقیر کے خلاف کوئی بات نہ سنی۔ اُن کی سر توقیر سے نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

آہستہ آہستہ سارے سکول میں یہ بات پھیل گئی کہ سر مکھی چوس نے احتشام صاحب سے لڑائی کا بدلہ حیدر کو فیل کر کے لیا ہے۔ احتشام صاحب کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سر مکھی چوس کو گولی سے اڑا دیں۔ ان کی مجبوری صرف یہ تھی کہ وہ حیدر کا سکول کا آخری سال تھا وہ اسے اس وقت کہیں اور لے کے نہیں جا سکتے تھے اور پھر اس کی فیس ادا کر کے تو سکول نے جیسے ان کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی تھی۔

دوسری طرف حیدر کے اپنے مسائل تھے۔

''یار! تم اتنے اُداس ہو تو جا کے اپنے والد سے صاف صاف بات کیوں نہیں کر لیتے؟ حیدر کے دوست آفاق نے موبائل پر گیم کھیلتے مشورہ دیا۔

''صاف بات؟'' حیدر نے بیزاری سے دوست کی طرف دیکھا۔

''کیا صاف بات کروں؟ ان کو بتا دوں کہ پرچے کے خوف کی وجہ سے سب کچھ یاد ہونے کے باوجود اپنا پرچہ پورا نہیں کر سکا۔ ٹکڑے کر دیں گے وہ میرے۔''

''تو پھر بھول جا..... مٹی ڈال اس بات پر۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ سر مکھی چوس نے جان بوجھ کے تمہیں فیل کیا ہے۔ تو سمجھنے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے؟'' آفاق کے پاس ہر مسئلہ کا حل تھا۔

''تم نہیں سمجھو گے آفاق۔ بابا گھر میں بھی ہر وقت سر کو کوستے رہتے ہیں اور یہ صرف میری غلطی کی وجہ سے ہے۔'' حیدر کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

''چھوڑ یار تو خواہ مخواہ دل پر لے رہا ہے۔ سر مکھی چوس سے تو اکثر لوگ ناخوش ہی رہتے ہیں۔ انہیں کون سی پرواہ ہوتی ہے۔'' آفاق نے جیسے مکھی اڑائی حیدر بے بسی سے آفاق کو دیکھ کے رہ گیا۔

احتشام صاحب کافی دیر سے فون پر کبھی کسی آدمی سے تو کبھی کسی سے بات چیت میں لگے ہوئے تھے۔ جب بات چیت ختم ہوئی تو آمنہ بولی:

''یہ آپ اتنی دیر سے کس سے باتیں کر رہے ہیں؟'' آمنہ نے اُن سے پوچھا۔

''حیدر کے کلاس فیلوز کے والدین سے اس مکھی چوس کے خلاف درخواست لکھوانے کے بارے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہوں'' تھکے انداز میں بولتے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

''اب ان پر یہ نئی دُھن سوار ہو گئی ہے۔'' آمنہ نے افسوس سے انہیں دیکھا۔

''آپ خواہ مخواہ کیوں اس بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں بھلا؟ حیدر بہت پریشان ہو رہا ہے۔'' آمنہ نے انہیں سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

''وہ کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ اس مکھی چوس نے اگر میرے بیٹے سے کسی قسم کی زیادتی کا سوچا بھی تو مسل کے رکھ دوں گا اُسے۔'' بات اب کہیں سے کہیں جا رہی تھی۔

''دیکھیں احتشام آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ سر توقیر کوئی دل کے بُرے شخص نہیں ہیں،'' مجھے حیدر نے خود بتایا ہے۔

''تم خاموش رہو یہ تمہارا سر درد نہیں۔'' احتشام صاحب نے دوٹوک انداز میں بات کاٹی۔ آمنہ ایک ٹھنڈی سانس لے کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد احتشام صاحب کسی کام سے باہر نکلے تو حیدر تلخی سے بھرا ہوا ماں کے پاس آیا ''مما بابا آخر اس بات کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہ تو سر کے پیچھے ایسے پڑ گئے ہیں جیسے کوئی ذاتی دشمنی ہو۔ مما نے حیدر پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ ایک بہت پرانی بات سے نہ چاہتے ہوئے بھی حیدر کو آگاہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

''تمہارے بابا جب تمہاری عمر کے تھے تو ان کے ساتھ ایک بڑا سنگین واقعہ ہو گیا تھا جس کے اثر سے وہ آج تک باہر نہیں نکل سکے۔'' مما لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رُکی۔

''پرچے کے دوران نقل کرتے ایک لڑکے نے پکڑے جانے پر ان کا نام لگا دیا تھا۔''

''ایسے کوئی کیسے کسی کا جھوٹا نام لگا سکتا ہے۔ کیا وہاں اور لوگ نہیں تھے۔'' حیدر ہکا بکا رہ گیا

''اتفاق سے جو جواب اس وقت احتشام لکھ رہے تھے، پرچی پر وہی کچھ لکھا تھا ان کا کوئی قصور نہیں تھا مگر وہ قصوروار بن گئے۔ تمہارے دادا بہت سخت ہوا کرتے تھے۔ بات کی تفصیل بعد میں سننے، سزا پہلے سنانے والے شخص۔ اس معاملے میں بھی سکول کی شکایت پر تفصیل معلوم کرنے یا احتشام سے بات سننے کے بجائے انھوں نے تمہارے بابا کو سزا دینے کی جلدی کی۔''

''دادا نے بابا سے بات نہیں کی؟''۔ حیدر نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔

''بات تو درکنار انہوں نے احتشام کو اپنی صفائی پیش کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے ماما۔'' حیدر حیران تھا۔

''زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے حیدر جو ہمارے وہم و گمان سے باہر ہوتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا مما؟'' حیدر حیرت کے جھٹکوں سے اُبھر نہیں پا رہا تھا۔

''نقل کرنے والا لڑکا احتشام کے ٹیچر سر حمید کا بیٹا تھا۔ آپکے دادا ابو کے برعکس وہ صحیح اور غلط کی تمیز کیے بغیر اپنے بچوں کی حمایت کرنے والے انسان تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے نا صرف بابا کو پورے سکول میں بدنام کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ انہیں سکول سے بھی نکلوا دیا۔ ایک طرف سکول میں وہ اُستاد اور گھر میں باپ۔ دونوں نے بجائے انصاف کرنے کے اپنے اپنے طریقے سے احتشام کو نیچا دکھایا۔ شاید اب تمہیں اپنے بابا کے طرزِ عمل کی وجہ سمجھ آ جائے۔'' آنسو اگر مما کی آنکھوں میں تھے تو نم حیدر کی آنکھیں بھی تھی۔

''دو غلط مل کے ایک صحیح نہیں بناتے مما۔۔ بابا اپنے ٹیچر کا بدلہ سر توقیر سے کیوں لے رہے ہیں۔'' حیدر بے بسی کی انتہا پہ تھا۔

''گیہوں کے ساتھ کبھی کبھی گھن بھی پس جاتا ہے بیٹا'' حیدر اور مما شکست خوردہ انداز میں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آگے کیا ہوگا۔ اس دن کے بعد احتشام صاحب نے سر توقیر سے بدلہ لینے کی اپنی کوشش میں اضافہ کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُن پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے۔ ان کے بچپن میں ہوئے واقعے کے کردار جیسے ان کے سامنے زندہ ہو کے آ گئے تھے۔ ان کو قریب سے جاننے والا کوئی شخص بھی یہ بات آسانی سے جان سکتا تھا کہ وہ اپنا پرانا بدلہ سر توقیر سے لینا چاہ رہے ہیں وہ جب جب سر کو دیکھتے انہیں سر حمید یاد آ جاتے جن کی نفرت نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا

تھا۔ حیدر اور مما ان کو سرگرمیوں سے بے حد پریشان تھے۔ خاص طور پر حیدر باپ کے سرتوقیر کے بارے میں بے رحمانہ تبصروں سے بہت دلبرداشتہ ہو رہا تھا سکول کے آخری دن چل رہے تھے جب دوستوں نے جاتے جاتے دوبارہ برگد کے پیڑ والی شرارت کرنی چاہی۔ حیدر سے پہلے دو لڑکے کامیابی سے درخت پہ دھاگہ باندھ آئے تھے۔ اب حیدر کی باری تھی ایک دم گہرے بادل چھا گئے اندر پرنسپل صاحب سرتوقیر کے ساتھ بیٹھے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔ حیدر کو نجانے کیا ہوا شائد اس نے وہاں کھڑے کھڑے کسی بھوت کو دیکھ لیا، یہ کوئی نہیں جان پایا۔ وہ اس دن سکول سے بہت خستہ حالت گھر پہنچا تھا۔ اسے بہت شدید الٹیاں آ رہی تھی اور بخار بھی بہت تیز تھا۔ حیدر کی اتنی شدید بیماری سے احتشام اور آمنہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دونوں میاں بیوی ہر بات بھلا کے بیٹے کی تیمارداری میں لگ گئے۔ حیدر ٹھیک تو ہو گیا مگر بہت گم صم رہنے لگا تھا۔ پھر امتحان سر پر آ گئے تو احتشام صاحب کا سرتوقیر کی طرف جنون بھی ٹھنڈا پڑنے لگا۔ یہ سکول او لیولز تک تھا۔ تو امتحانات کے بعد حیدر کا تعلق بظاہر پرانے سکول سے چھٹ گیا اور یوں احتشام صاحب اور سرتوقیر کی دشمنی پر دھیرے دھیرے وقت کی گرد پڑتی چلی گئی۔ حیدر نے دوبارہ پڑھائی میں محنت شروع کر دی۔ اے لیولز پھر بیچلر اور سکالرشپ۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ حیدر کی زندگی کا یہ وہ دور تھا جس میں اَن تھک محنت تھی اس کی نظریں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے میں لگی تھی۔ اس دوران میں اس نے کبھی کام کے علاوہ کسی چیز پر دھیان نہیں دیا۔ دوست بلاتے، آمنہ اور احتشام بھی اسے آرام کرنے کا کہتے۔ مگر حیدر پر عجیب سی دھن سوار تھی۔ پڑھائی کے بعد جو بزنس اس نے شروع کیا اس میں اللہ نے بہت برکت دی محنتی تو وہ شروع سے ہی تھا کچھ سالوں میں ہی اس نے اپنی کمپنی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اپنے پروفیشن کے علاوہ وہ ایک بہترین موٹیویشنل سپیکر کے طور پر بھی جانا جاتا تھا۔ دس ستمبر کو جب اسے اساتذہ کے عالمی دن کے موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا گیا تو اسے سالوں پرانے قرض کی یاد آئی جس کے اتارنے کا وقت آ گیا تھا۔

ہزاروں کے مجمعے کے سامنے روانی سے بولتے حیدر کو یوں لگ رہا تھا جیسے سامنے صرف احتشام اور سرتوقیر بیٹھے ہیں اور انصاف کا پلڑا آج اس کے ہاتھ میں ہے۔ آج وہ چودہ سال کا وہ کمزور حیدر نہیں تھا جو خوف کے مارے باپ کو کبھی حقیقت نہیں بتا پایا تھا۔

ایڑی کے کانٹے کو نکالنے کا لمحہ آ گیا تھا۔

''میں بہت خوش قسمت ہوں جس کو بابا جیسا ذمہ دار اور محنتی، محبت کرنے والے والد اور'' احتشام صاحب کا سینہ فخر اور خوشی سے چوڑا ہونے لگا۔ انہیں لگا جیسے ان کی ساری عمر کی محنت کا پھل مل گیا ہو۔

''میری دوسری خوش بختی، سرتوقیر جیسے عظیم انسان کا سٹوڈنٹ ہونا ہے۔'' اس نے عقیدت سے سادگی اور نرمی کے تاثرات لیے سرتوقیر کو دیکھا۔ احتشام صاحب کے ماتھے پر شکنیں پڑنے لگی حیدر کے منہ سے کبھی کبھار سرتوقیر کا ذکر انہیں ویسے ہی چڑا دیا کرتا تھا اور وہ اکثر اسے جھڑک دیتے تھے۔

''حیدر کو ہو کیا گیا ہے؟؟'' ناگواری سے انھوں نے سوچا آڈیٹوریم میں اپنی جگہ پر بیٹھے ان کی نظر جب سرتوقیر پر پڑی تھی تو انہیں بے حد برا لگا تھا۔

''ضرور پرنسپل صاحب نے انہیں بلایا ہوگا ورنہ حیدر کو کیا پڑی تھی ایسے گھٹیا انسان کو بلانے کی''۔ ''حیدر کی تقریر کا سارہ مزہ جیسے کرکرا ہونے لگا۔

''میری ترقی کا پہلا کریڈٹ میرے والد کو جاتا ہے جنہوں نے ہر حال میں میری ضروریات کو ترجیح دی مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب چاہتے ہوئے بھی وہ میرے لیے کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ وہ میری فیس تک کا انتظام نہیں کر پا رہے تھے۔'' احتشام کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے پورا مجمع دم سادھے جیسے اپنے پسندیدہ سپیکر کی زندگی کی داستان سُن رہا تھا۔

''فیس ادا نہ ہونے کا مطلب تھا سال ضائع ہونا۔ اس وقت ایک فرشتہ سامنے آیا اس نے میری فیس ادا کی۔ یہ ایسی بھی کوئی نرالی بات نہیں۔ بہت سارے لوگ دیتے ہیں مگر کوئی اپنا نام ایسے نہیں چھپاتا جیسے دینے والے نے چھپایا'' احتشام صاحب کا بلڈ پریشر کسی نامعلوم وجہ سے بڑھنے لگا۔

''آپ لوگ یہ جان کے حیران ہونگے کہ میرے والد اور سرتوقیر کے بیچ میں بہت رنجشیں تھی۔'' روانی سے کہتے ایک گہرا سانس لے کے جیسے ہمت جمع کرنے کی کوشش کی۔

''ان رنجشوں میں سر کا اتنا قصور نہیں تھا جتنا شائد حالات کا۔'' احتشام صاحب نے بے یقینی سے حیدر کو دیکھا۔

''میرے بابا جذباتی تھے، غصے والے تھے۔'' حیدر اذیت سے مسکرایا۔

''اپنے بچپن کے ایک حادثے کو لے کے دنیا بھر کے اساتذہ سے ناراض تھے۔ ان کی سرتوقیر کے خلاف کوششیں ہمیشہ یک طرفہ رہی۔ سر نے کبھی ان کی زیادتی کے جواب میں پلٹ کے یہ نہیں کہا کہ تم پر میرا احسان ہے میں نے تمہارے بیٹے کی فیس دی ہے اس کا مستقبل بچایا ہے۔'' حیدر نے آنکھیں باپ کی آنکھوں میں ڈالی ہوئی تھی۔

''مجھے یہ بات بہت حادثاتی طور پہ پتہ چلی مگر اس وقت میں صدمے سے بیمار تو پڑ سکتا تھا اپنے بابا کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔'' ایک جھماکے سے احتشام صاحب کے سامنے وہ دن آ گیا جب برگد کے سائے میں ڈر کے حیدر بیمار پڑا تھا۔ انہیں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اپنی ایک، ایک زیادتی جس میں وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''آج آپ سب لوگوں کے سامنے میں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ بات

بقیہ صفحہ نمبر 44

سونے چاندی کا سرد محل

احمد عدنان طارق

ایک دن معاذ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک ننھی چڑیا پڑی نظر آئی جو زخمی ہونے کے باعث درد سے چلا رہی تھی اور اپنے زخمی پر کو اِدھر اُدھر ہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ معاذ نے اُسے اُٹھایا اور گھر لے آیا۔ اُس نے ایک گتے کا ڈبا لیا اور اُس میں ایک نرم مخملی کپڑا بچھایا اور نہایت آرام سے اُس میں چڑیا کو لٹا دیا۔ کئی دن وہ ننھے پرندے کی خدمت میں لگا رہا۔ آہستہ آہستہ چڑیا کا پر ٹھیک ہو گیا۔ معاذ چڑیا کو ٹھیک ہوتے دیکھ کر بہت خوش تھا، لیکن ساتھ ہی اداس بھی ہو رہا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ چڑیا ٹھیک ہو گئی تو اُڑ جائے گی اور اُسے بھول جائے گی۔

لیکن چڑیا اُسے نہیں بھولی۔ کچھ دن ہی گزرے تھے کہ چڑیا معاذ کے گھر کی چوکھٹ پر آئی اور انتظار کرنے لگی کہ کب معاذ گھر سے باہر آتا ہے۔ اُس کی چونچ میں ایک زرد بیج دبا ہوا تھا جو دراصل ایک بڑے کدو کا تھا۔ اُس نے وہ بیج معاذ کے قدموں میں گرا دیا اور پھر پرواز کر گئی۔ معاذ نے وہ بیج اپنے باغیچے میں بو دیا۔ بہت جلد بیج سے ایک ننھا پودا پھوٹا اور دنوں میں ایک مضبوط بیل بن گیا۔ اُس پر ایک شگوفہ بنا اور آہستہ آہستہ ایک حلوا کدو بن گیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ کدو عام کدوؤں سے بہت بڑا اور طاقتور ہو گیا۔

اور پھر جب وہ پک گیا تو معاذ نے اُسے کاٹا، لیکن کدو کے اندر اُس نے جو دیکھا وہ اُسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا، کیونکہ کدو میں بیجوں اور گودے کی جگہ سونے اور چاندی کے سکے بھرے تھے۔ جو کدو کے کٹنے کی وجہ سے چھن چھن کرتے ہوئے فرش پر گر رہے تھے۔ کدو میں خزانہ بھرا ہوا تھا۔ ابھی ایک، دو گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ خزانے والی بات پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ معاذ کی خوشی میں پورا گاؤں خوش تھا۔ اُس کا خاندان اگرچہ بہت محنتی تھا، لیکن پھر بھی اُن کی غربت دور نہیں ہوئی تھی۔ اب اُن کے دن پھرنے والے تھے۔

سب سے بڑی خوشی اُن کے لیے یہ تھی کہ ایک ننھے پرندے کے ساتھ کی گئی مہربانی اُن کے لیے خوش قسمتی کا باعث بن گئی تھی۔ دنیا میں بھی اور شاید اگلے جہان میں بھی، لیکن اس گاؤں میں اگر معاذ جیسا نیک لڑکا رہتا تھا تو حسن جیسا بُرا لڑکا بھی اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ معاذ کا ہم عمر اور پڑوسی بھی تھا۔ وہ بلا کا لالچی تھا اور ہمیشہ معاذ سے حسد بھی کرتا تھا۔ اُس کے کانوں میں بھی معاذ کو خزانہ ملنے کی خبر پہنچی۔ تو اُس نے وقت ضائع کیے بغیر فیصلہ کیا کہ وہ بھی اسی طریقے سے خزانہ حاصل کرے گا۔ اُس نے اس کام کے لیے ایک ننھے پرندے کا انتخاب کیا اور جان بوجھ کر اُسے پتھر مارا۔ بے چارے پرندے کو پتھر لگا تو وہ اُڑتے اُڑتے زمین پر آ گرا اور اُس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ درد کی شدت سے پرندہ مرنے والا ہو گیا۔

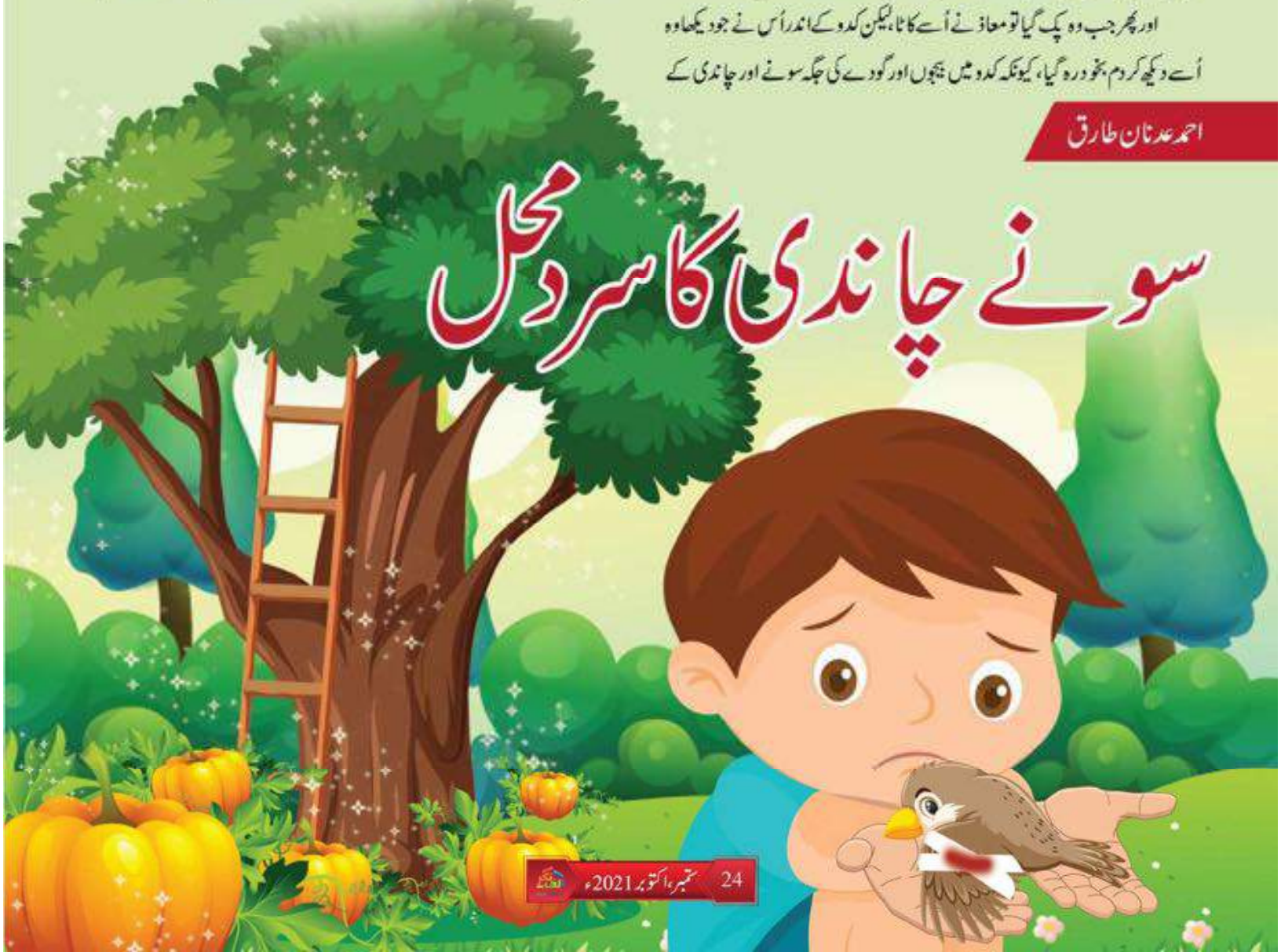

حسن نے اُسے اُٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔ پھر اُس نے سارے گاؤں والوں کو زخمی پرندہ دکھایا اور گویا احسان کرتے ہوئے پرندے کا علاج کرنے لگا۔ جیسے ہی پرندے کا زخم مندمل ہوا اور وہ اُڑنے کے قابل ہوا، تو حسن نے اُسے جان بوجھ کر اُڑا دیا۔ پھر وہ آرام سے بیٹھ کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگا۔ پھر ویسے ہی ہوا جیسا حسن سوچ رہا تھا۔ وہ پرندہ واپس آیا اور اُس نے بھی اپنی چونچ سے کدو کا ایک بیج حسن کے پیروں میں پھینک دیا۔

حسن بھاگتا ہوا گیا تاکہ جلدی سے بیج کو بوئے۔ اس بیج سے بھی معاذ کے پودے کی طرح پودا نکلا اور تیزی سے بڑھنے لگا اور پھر جلد ہی اُس پر ایک کدو اُگ آیا۔ اب ہر وقت وہ کدو کے پاس بیٹھا اُس کو تکتا رہتا تھا تاکہ وہ پک جائے تو وہ اُسے دو ٹکڑوں میں کاٹ لے۔ گاؤں کے لوگ اُس کے لالچ کے بارے میں بُرے تبصرے کرتے، لیکن حسن کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ آخر کار حسن کا کدو بھی پک گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے چھری سے کدو کے دو ٹکڑے کر دیے۔ کدو کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اُسی طرح جیسے معاذ کے کدو کے ہوئے تھے لیکن حسن کے کدو میں کوئی خزانہ چھپا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ کدو میں ایک بونا چھپا بیٹھا تھا جس کی لمبی ڈاڑھی اُس کے گھٹنوں کو چھو رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر سختی نمایاں تھی اور اُس نے فوجیوں جیسی وردی پہن رکھی تھی۔ وہ حسن کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ بولا:

''ہوں! تو پھر آؤ میرے ساتھ چلو۔'' اُس نے زور سے حسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب ہی کدو کے اندر گودے کی کاشوں سے ایک سیڑھی بن کر سیدھی آسمان کی طرف جانے لگی۔ بونا حسن کو بازو سے پکڑے سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ حسن بونے سے بازو چھڑوانے کی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن بونے کا ہاتھ تو آہنی شکنجہ تھا جس سے اپنا ہاتھ چھڑوانا حسن کے لیے ناممکن تھا۔

ایک بار ہمت کر کے حسن نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو خوف کے مارے اُس کی سٹی گم ہو گئی کیوں کہ سیڑھی کے جس زینے پر وہ قدم رکھتے، اُس سے نیچے والا زینہ جھڑ کر زمین پر گرتا جا رہا تھا اور وہ اتنی اونچائی پر پہنچ گئے تھے کہ زمین کی طرف چھلانگ لگانا ناممکن تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ اسی اندھیرے میں سیڑھی پر چڑھتے گئے۔ آخر کار سیڑھی کے زینے ختم ہوئے تو وہ ایسی عجیب و غریب جگہ پہنچ گئے تھے جو بہت روشن لیکن انتہائی سرد تھی۔ پھر وہ ایک لمبی، ویران سڑک پر چلنے لگے جو دودھیا روشنی سے نہائی ہوئی تھی۔ حسن اپنے سانس ترتیب ہی دے رہا تھا کہ اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے بونے سے پوچھا:

''ہم کہاں ہیں جناب؟'' بونا بولا:

''یقیناً چاند پر سرد محل میں۔'' تب سڑک بھی ختم ہو گئی۔ وہاں ایک بہت وسیع عمارت سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ اُس کی دیواریں خالص سونے سے بنی ہوئی تھیں اور کھڑکیاں چاندی کی۔ وہاں بونا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

''میرا خیال ہے کہ اتنے سونے اور چاندی سے تمہارا لالچ سے بھرا دل مطمئن ہو جائے گا۔ یہ اتنا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔'' حسن نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہر چیز ساکن اور ہر طرف سکوت تھا۔ لگتا تھا وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو زندہ ہو اور سرد ہوا کے تھپیڑے اُس کے جسم میں گھسے جا رہے تھے۔

یخ بستہ ہوا سے اُس کی ہڈیاں اُس کا خون اور اُس کا دل جما جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سردی سے تھراتا ہوا بولا:

''جناب! مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔ کیا اب میں گھر جا سکتا ہوں؟''

بونا اپنے سخت لہجے میں اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولا:

''اچھا! کیا اب تم نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے؟'' پھر اُس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا ڈر کے مارے حسن کی جان نکل گئی۔ بونا بولا:

''میں تمہیں آزاد کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

پھر وہ حسن کو لے کر محل کے ایک کونے میں گیا جہاں دارچینی کا ایک درخت کھڑا تھا، لیکن جب حسن نے غور سے درخت کو دیکھا تو اُسے لگا جیسے اس درخت کا تنا اور شاخیں سب سونے کی ہیں اور اُس کے پتے قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ بونے نے حسن کے ہاتھ میں ایک چاندی کا کلہاڑا دیا اور بولا:

''تم اس کلہاڑے سے اس درخت کو کاٹو۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں فوراً گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔ تم خود دیکھ سکتے ہو کہ اتنا چاندی سونا تمہاری زندگی کے لیے کافی ہوگا۔''

حسن بے چارگی سے بولا:

''لیکن اگر میں امیر ہونا نہ چاہوں اور یہ سونا چاندی حاصل نہ کرنا چاہوں تو؟'' بونا بولا:

''اس بارے میں تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا جب تم نے جان بوجھ کر بے بس پرندے کی ٹانگ توڑی تھی۔ اب قسمت بدلنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب یہ کلہاڑا پکڑو اور درخت کاٹنا شروع کر دو۔'' بھاری دل کے ساتھ حسن نے کلہاڑا ہاتھ میں تھاما اور زور سے درخت پر چلا کر ایک ٹہنی کاٹی۔ پھر اُس نے دل میں سوچا کہ شکر ہے یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے، لیکن تب ہی اُس کے کندھوں میں شدید درد ہونے لگا۔ وہ جیسے ہی درخت پر کلہاڑا چلاتا اُسے لگتا جیسے کوئی سفید سایہ اُس سے چمٹ کر اُسے زور لگانے سے روک رہا ہے۔ وہ چلایا:

''مجھے چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر وہ کلہاڑا لے کر سفید سائے کے پیچھے بھاگا، تو وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ تب تک کلہاڑے کا نشان درخت سے مٹ گیا۔ بار بار یہ ہی ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ حسن ابھی بھی سونے چاندی کے سرد محل میں پھنسا ہوا کلہاڑا چلا رہا ہے۔ بونا بھی حسن پر ہر وقت نظر رکھے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں کے ذہن میں بھی امیر ہونے کے لیے کوئی بڑا منصوبہ آئے تو چاند کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھیے گا اور حسن کو یاد کیجیے گا۔ ☆

مٹّی کا قرض

الطاف حسین

جنگ ستمبر 1965ء شروع ہو چکی تھی۔ باٹا پور کے مقام پر حق و باطل کا معرکہ زور شور سے جاری تھا۔ ولولہ انگیز نعروں، مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ، بموں اور گولوں کے دل ہلا دینے والے دھماکوں اور گرد و غبار نے یہاں عجیب سماں پیدا کر رکھا تھا۔ پاکستانی فوج اپنے دیرینہ دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹی ہوئی تھی۔ پاکستانی جانبازوں نے ملک و قوم کی خاطر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ چھے اور سات ستمبر کی درمیانی رات پاک فوج نے ''بی آر بی'' (بمبانوالہ راوی بیدیاں) نہر کے تمام پل اڑا دیے تھے۔ اب صرف ایک پل باقی تھا۔ دوسرے لفظوں میں اب دشمن کے لاہور میں داخلے کے لیے یہی پل واحد راستہ رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈوگرئی گاؤں پر طوفانی یلغار کے ذریعے قبضہ کرنے کے بعد اس کی تمام مشین گنوں اور توپوں کا رخ باٹا پور پل کی طرف ہو گیا تھا۔ بنیے کی فوج ہر قیمت پر اس پل کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتی تھی۔ بہ صورت دیگر اسے وہیں رہنا تھا جہاں وہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا۔

''بی آر بی'' نہر کے آگے لڑنے والی پاک فوج میں ایک جوان محمد حیات بھی تھا۔

ایک موقع پر جنگی حکمت عملی کے تحت اچانک پاکستانی جانبازوں کو پیچھے آنے کا حکم دیا گیا۔

''محمد حیات! آؤ ہم بھی پیچھے نکلنے کی کوشش کریں۔'' محمد حیات کے ساتھ مورچہ بند ساتھی نے کہا۔

''نہیں محمد حیات اب کسی قیمت پر پیچھے نہیں جائے گا۔'' محمد حیات کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''کیوں؟'' ساتھی نے استفساریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''علی خان!'' محمد حیات اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے غصے سے بولا ''کیوں کے سوال میں نہ الجھو، اگر پیچھے ہی ہٹنا تھا تو پھر مجھے اسلحہ کیوں دیا گیا تھا؟ میرے پاس ابھی پوری چالیس گولیاں موجود ہیں۔ جب تک یہ تمام گولیاں دشمن پر فائر نہیں ہو جاتیں میں مورچہ نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں اگر تم پیچھے جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو میں تمھیں روکوں گا نہیں۔''

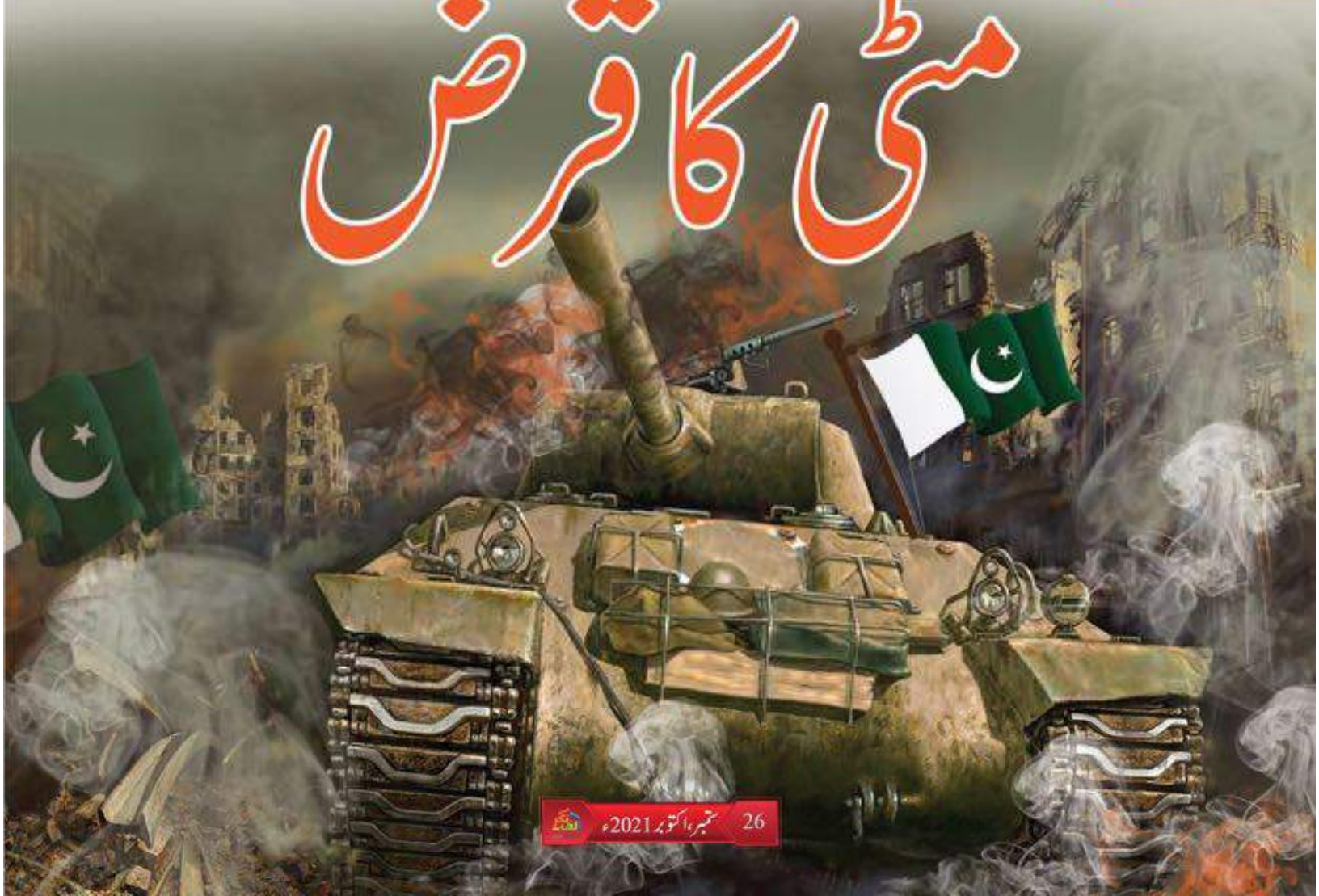

''محمد حیات! کیا تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟'' علی خان کی نظریں محمد حیات کے پرعزم چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں بالکل سوچ سمجھ کر۔'' محمد حیات نے جواب دینے کے بعد سوال کر دیا ''کیا تمھیں کوئی شک ہے؟''

''نہیں شک تو نہیں ہے۔'' علی خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیا ہے؟'' محمد حیات نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، لیکن میرا مشورہ ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔'' علی خان نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''زیادہ دیر تک اور بار بار سوچنے سے فیصلے کمزور ہو جایا کرتے ہیں علی خان۔'' محمد حیات معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''اس لیے میں دوبارہ نہیں سوچوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ مجھے اپنے فیصلے پر مرتے دم تک قائم رکھے گا۔ مجھے مزید کچھ نہیں کہنا اب تم جاؤ۔''

علی خان خاموشی سے مورچے سے باہر نکل گیا۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ محمد حیات نے پتھر پر لکیر کھینچ دی ہے۔ اب وہ کسی صورت بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ کچھ دیر بعد محمد حیات کے مورچے کے دائیں بائیں موجود تمام مورچے خالی ہو گئے۔

.....☆.....

آہاہاہاہاہا..... آہاہاہاہا..... بالآخر ہم نے دشمن کو مورچے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جنرل چودھری کی ''سینا'' (فوج) سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ ہزار بار سوچنا پڑتا ہے۔'' ڈوگرئی گاؤں کے سب سے محفوظ مورچے میں چھپا بھارتی فوج کا مکروہ شکل کرنل زوردار قہقہہ لگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا سر! اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟'' کرنل کے سیکنڈ ان کمانڈ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پروگرام'' بھارتی کرنل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''ہاں! اب میرا پروگرام یہ ہے کہ ہم ان مورچوں پر بھی قبضہ کریں گے۔ تم ایسا کرو ''انفینٹری'' (پیدل فوج) کے پچاس جوان لے کر ان مورچوں تک جاؤ۔''

''سر م م میں ں ں ں؟'' سیکنڈ ان کمانڈ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''ہاں تم ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب وہاں کوئی نہیں ہے، دشمن تمام مورچے خالی کر گیا ہے۔ فکر نہ کرو ہم تم لوگوں کو مکمل ''کور'' دیں گے۔'' کرنل نے اپنے نائب کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اوکے سر! میں جاتا ہوں، لیکن مجھے اور میرے جوانوں کو پورا پورا ''کور'' دیجیے گا۔'' سیکنڈ ان کمانڈ نے نہ چاہتے ہوئے بھی پاکستانی مورچوں تک جانے کی حامی بھر لی لیکن اندر سے وہ بہت خوف زدہ تھا۔

''میں نے کہا نا، تم اس کی فکر نہ کرو۔'' بھارتی کرنل مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ''جاؤ اور وہاں پہنچتے ہی مجھے ''اوکے'' رپورٹ دینا نہ بھولنا۔''

''رائٹ سر!'' سیکنڈ ان کمانڈ نے کہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مورچے سے باہر نکل گیا۔

.....☆.....

ادھر محمد حیات کی عقابی نظریں ڈوگرئی گاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کئی بھارتی فوجی رائفلیں تانے آہستہ آہستہ پاک فوج کے چھوڑے ہوئے مورچوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر تاک تاک کر مشین گن کا ٹرائیگر دبانے لگا۔ اگلے لمحہ گنتی شروع ہو گئی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر اور اپنے آگے جاتے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر پیچھے آنے والے بھارتی فوجیوں نے تیزی سے ادھر اُدھر بکھر کر پوزیشنیں لے لیں۔

''سر! آپ تو کہہ رہے تھے دشمن کے تمام مورچے خالی ہو چکے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہم پر یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟ میرے چھے جوان مر گئے ہیں سر۔'' سیکنڈ ان کمانڈ وائرلیس سیٹ پر چیخ رہا تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' جواب میں بھارتی کرنل کی غصیلی آواز سنائی دی ''ابھی تمھارے چھے جوان مرے ہیں، چوالیس ابھی باقی ہیں۔ ہوشیاری سے آگے بڑھو اور مورچوں میں جو دو چار دشمن فوجی ہیں انھیں ختم کر دو۔ جب تک کام ختم نہ ہو جائے۔ وائرلیس پر مجھے تمھاری آواز سنائی نہیں دینی چاہیے سمجھے؟''

''رائٹ سر! اوکے سر!'' سیکنڈ ان کمانڈ نے وائرلیس سیٹ کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے اردگرد کھڑے فوجیوں سے بولا ''بھگوان جنرل چودھری کا بیڑا غرق کرے جس نے بیٹھے بٹھائے ہم سب کو مصیبت میں پھنسا دیا۔''

''سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن کیا کریں اب تو ہم سب جنگ کے جال میں بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ بھگوان جانے کب اس مصیبت سے ہماری جان چھوٹے گی؟'' ایک بھارتی فوجی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''سر! مجھے تو یہاں سے زندہ بچ کر دوبارہ دہلی جانا ممکن نظر نہیں آتا۔'' ایک اور فوجی اپنے دل میں موجود خدشے کو زبان پر لے آیا۔

''فکر نہ کرو بھگوان ہم سب کی رکشا کرے گا۔ چلو اب ''کرالنگ پوزیشن'' میں آجاؤ اور بڑی احتیاط سے آگے بڑھو۔'' سیکنڈ ان کمانڈ لرزتی آواز میں بولا۔ اس کے بعد بھارتی فوجی آہستہ آہستہ اپنی دانست میں بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ سیکنڈ ان کمانڈ سب سے پیچھے تھا۔

اُدھر محمد حیات بھی غافل نہ تھا۔ ماحول پر یکدم طاری ہونے والی خاموشی کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اب وہ بھی ممکنہ حملے کا جواب دینے کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار تھا اور پھر جوں ہی پچاس گز کے فاصلے پر کھڑے درختوں کے قریب پہنچ کر بھارتی فوجی حملہ کرنے کے لیے ایک ساتھ کھڑے ہوئے محمد حیات کی مشین گن آگ اگلنے لگی اور گنتی کا عمل دوبارہ شروع ہوگیا۔ ''سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ اور پھر گنتی چالیس پر آکر رک گئی۔ محمد حیات کے مورچے سے پچاس گز کے فاصلے پر بکھرے چونتیس وجود اور ان سے دور پیچھے پڑے چھے مزید بھارتی فوجیوں کے لاشے اس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ اس نے ایک گولی بھی ضائع نہیں کی تھی۔ چالیس گولیاں اور چالیس لاشیں۔ محمد حیات نے اس اعتماد کو آخری گولی فائر کرنے تک بحال رکھا تھا۔ شیر دل محمد حیات کی مشین گن اب خاموش تھی، لیکن وہ اس حالت میں بھی دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا جوں ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے مورچے کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے، تو وہ مشین گن کو اس کے منہ کی طرف سے پکڑ کر سامنے آنے والے بھارتی فوجیوں میں سے دو چار کو اس کا ''بٹ'' مارنے کے لیے تیار ہوگیا۔

''چلو اب تم لوگ مورچے سے باہر نکل آؤ۔ تمھاری کہانی ختم ہوگئی ہے۔'' سیکنڈ ان کمانڈ نے گرجنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے گلے کا ساتھ چھوڑ گئی۔

محمد حیات اچانک اچھل کر مورچے سے باہر نکلا اور نہایت باوقار انداز میں بھارتی فوجی کمانڈر اور اس کے فوجیوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''اوروں کو بھی کہو، مورچے سے باہر نکل آئیں۔'' کمانڈر چلایا۔

''میرے ساتھ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔'' جوان محمد حیات نے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' سیکنڈ ان کمانڈ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''اندر تمھارے ساتھی موجود ہیں جس طرح تم نے خاموشی سے مورچہ چھوڑ دیا ہے انھیں بھی کہو کہ وہ بھی مورچے سے باہر آجائیں۔''

''مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ تمھیں اگر میری بات پر یقین نہیں ہے تو اپنے فوجیوں سے کہو کہ وہ مورچہ دیکھ کر تصدیق کرلیں۔'' محمد حیات نے نہایت پرسکون انداز میں کہا۔

بھارتی فوجیوں نے تمام مورچے اچھی طرح دیکھے، لیکن ان میں سے ایک مورچے میں بھی کوئی پاکستانی جوان موجود نہیں تھا۔

''سر! یہ ٹھیک کہتا ہے۔'' ایک بھارتی فوجی بولا۔

''اسے پکڑو اور وہ سامنے درخت سے باندھ دو۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے؟'' سیکنڈ ان کمانڈ نے غیر یقینی انداز میں محمد حیات کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دس زندہ بچ جانے والے فوجیوں کو حکم دیا، لیکن اس سے پہلے کے کوئی بھارتی فوجی آگے بڑھتا جوان محمد حیات نے انتہائی پھرتی سے ہاتھ میں پکڑی مشین کا ''بٹ'' اپنے قریب کھڑے دو بھارتی فوجیوں کے منہ پر مارا۔ ان دونوں نے اپنی رائفلیں پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پکڑ لیا۔

بھارتی فوجی اور ان کا کمانڈر پہلے تو کچھ نہ سمجھ سکے کہ یکدم یہ کیا ہوگیا ہے، لیکن فوراً ہی انھوں نے مشترکہ حملہ کر کے محمد حیات کو قابو کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس پاکستانی جانباز کو ایک درخت سے باندھ دیا اور پھر اپنے کمانڈر کے اشارے پر تین طرف سے رائفلوں کی سنگینیں تان کر محمد حیات کی طرف بڑھے۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ سنگینیں اس کے جسم کے مختلف حصوں میں اتر گئیں اور جوان محمد حیات نے بڑے صبر کے ساتھ اپنی حیات اپنے مالک کے حوالے کردی۔ آج اس نے اپنی مٹی کا وہ قرض اتار دیا تھا اور پوری قوم کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ ☆

ڈاکٹر بلّو بلّو نگڑا

نوید احمد خان

بی بی بطخو اپنے بچے کو لیے ڈاکٹر بلّو بلّو نگڑا کے کلینک میں داخل ہوئی۔ بی بی بطخو کا بچہ اپنا کان پکڑے کراہ رہا اور بی بی بطخو بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بی بی بطخو کے بچے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ شرارتی تھا لیکن اس وقت واقعی شدید تکلیف سے دوچار تھا اس لیے چپ چاپ ڈاکٹر بلّو کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بلّو نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا:

''کیوں بھئی شرارتی بچے کیا ہو گیا تمہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب یہ دو دن سے کہہ رہا تھا کہ اس کے کان میں درد ہے۔ میں نے کئی مرتبہ تیل ہلکا سا گرم کر کے اس کے کان میں بھی ڈالا کہ آرام آ جائے لیکن کل رات سے شدید بے چین ہے اور درد سے تڑپ رہا ہے۔ بے چارے سے بات بھی نہیں کی جا رہی۔'' بی بی بطخو نے ہلکان ہوتے ہوئے ڈاکٹر بلّو کو ساری تکلیف بتائی۔

''ہائیں! یہ دو دن سے کان کے درد سے تڑپ رہا ہے اور آپ آج اسے میرے پاس لا رہی ہیں؟ یہ بہت بری بات نہیں بطخو۔'' ڈاکٹر نے فوری ضروری سامان کے ساتھ اس کا کان صاف کرتے ہوئے بی بی بطخو سے کہا۔

''دیکھیں! کتنی پس اور خون اس کے کان میں جمع ہو چکا ہے۔ بیٹا! کیا تم نے اپنے کان میں کوئی چیز ڈالی ہے؟'' ڈاکٹر نے بچے سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! بالکل میرے کان میں درد ہو رہا تھا۔ مجھے لگا میرے کان میں کوئی چیز چلی گئی ہے اس لیے میں نے پنسل سے اپنا کان صاف کیا تھا۔'' بچہ تقریباً روتے ہوئے بولا۔

''اوہو! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' ڈاکٹر بلّو بدستور اس کے کان کی صفائی کر رہے تھے۔

''بیٹا! یہ کان ہمارے جسم کا بہت نازک حصہ ہوتا ہے۔ خاص کر اس کا اندرونی حصہ۔ اس کے ساتھ ایسے تجربات نہیں کرنے چاہئیں۔ اگر آپ کو کچھ محسوس ہو تو بھی آپ بڑوں کو بتائیں۔ اور بی بی بطخو یہ دیسی ٹوٹکے وقتی طور پر کارگر ہوتے ہیں۔ تکلیف بڑھنے کی صورت میں ڈاکٹر کو فوری طور پر دکھانا چاہیے۔'' ڈاکٹر بلّو نے کہا۔

''کان میں کوئی چیز مارنے سے کان کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کان میں میل کچیل جمع ہو جائے یا تو وہ بھی کان درد کا باعث بن سکتا ہے۔'' ڈاکٹر بلّو انہیں سمجھا رہے تھے۔

''میں بس کان صاف کر کے اسے دوائی دے دیتا ہوں۔ اسے آرام آ جائے گا۔'' ڈاکٹر بلّو اپنے دوائی کے خانے کی طرف آ گئے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت شکریہ اس درد میں اور کیا کیا احتیاط کرنی چاہیے؟''

بی بی بطخو نے ڈاکٹر بلّو سے استفسار کیا۔

''بہن بطخو! آج کل بارشوں کا موسم ہے۔ بچے بارش میں خوب نہاتے ہیں۔ اور ویسے بھی گرمیوں میں سوئمنگ پول پر نہانے کے پروگرامز بھی خوب بناتے ہیں یہ بچے۔ انہیں چاہیے کہ یہ ایسی سرگرمیوں کے بعد اپنا جسم اور کان خوب اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں۔ ورنہ کان میں پانی پڑ جانے سے یہ درد ہو سکتا ہے اور یہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ بخار، بدن میں درد، بے چینی، کھانے پینے میں رکاوٹ حتیٰ کہ سماعت چلی جانے تک کا اندیشہ ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر بلّو دوائی بنا کر اپنی ٹیبل پر آ چکے تھے۔

''میں نے اس کے لیے یہ دوائی بنا دی ہے۔ پابندی سے اسے دوا کھلائیے گا۔ اور ہاں، اس دوران اسے کوئی بھی سخت چیز کھانے مت دیجیے گا ورنہ یہ درد مزید بڑھ جائے گا۔ ہلکی پھلکی غذا کھلائیں۔ پانی کا زیادہ استعمال کروائیں اور یہ نیند مکمل لے۔ انشاءاللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر بلّو نے دوا بی بی بطخو کے تھماتے ہوئے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' بی بی بطخو نے ممنونیت سے ڈاکٹر بلّو کو کہا۔

''کوئی بات نہیں بی بی بطخو! بس ایک بات کا خیال رکھنا آئندہ ایسی کسی بھی تکلیف میں دیسی ٹوٹکے آزمانے کی بجائے فوری طور پر ڈاکٹر کو دکھایا کرو۔ خدانخواستہ یہ بیماریاں بڑھ جائیں تو شدید تکلیف اور بے چینی کا باعث بنتی ہیں۔''

بی بی بطخو نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے بچے کو لیے ڈاکٹر بلّو کے کلینک سے نکل آئی۔ ☆

ساشا اور کوکو

فرزین لہرا

زینب کو سب پیار سے زینی بلاتے تھے۔ وہ بلا کی ذہین تھی مگر ساتھ ہی بے حد شرارتی بھی تھی۔ سب اس کی شرارتوں سے عاجز تھے لیکن یہ بات بھی تھی کہ آج تک اس کی شرارتوں سے نہ کسی کی دل آزاری ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کا کوئی نقصان۔ زینی کے پاس کوئی بھی جا بیٹھے، مسکرائے بنا نہ رہ سکتا۔ ایک جادو سا تھا اس کی باتوں میں۔ جب وہ اپنی بات شروع کرتی تو بنا کسی کومہ یا فل اسٹاپ کے تواتر سے بولتی چلی جاتی، ایک بات بتا رہی ہوتی تو وہ ابھی ختم بھی نہ ہوتی کہ دوسری شروع کر دیتی۔ سننے والا اپنی باری کا انتظار کرتا رہ جاتا کہ یہ بی بی سانس لینے کو رکیں تو ہم بھی اپنی رائے دے سکیں لیکن نہ جی! وہ زینی ہی کیا جو کسی اور کو بولنے کا موقع دے۔

ایک دن اسکول میں انگریزی کا پیریڈ چل رہا تھا۔ انگریزی کے سر اس دن غیر حاضر تھے جس کی وجہ سے دوسرے ٹیچر کلاس لینے آگئے جو دیکھنے میں بہت ہی سخت مزاج معلوم ہوتے تھے۔ نئے سر نے آتے ہی استاد کی مخصوص کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑے ہی رعب سے اپنا تعارف کروایا۔''

السلام علیکم! میرا نام ناصر خان ہے، میں اس اسکول کی بارہویں جماعت کو میتھس پڑھاتا ہوں، چوں کہ آج آپ کے استاد غیر حاضر ہیں تو مجھے ان کی جگہ بھیجا گیا..... ابھی سر اتنا ہی بولے تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔'' مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ضروری کام سے بلایا ہے سر دوبارہ بولے جب تک میں واپس نہ آجاؤں آپ لوگوں نے شور نہیں مچانا خاموشی سے بیٹھ کر اپنا اپنا کوئی بھی کام کریں۔''

زینی اسکیچ بک نکال کر اسکیچنگ کرتی رہی پھر جلد ہی بور ہوگئی۔ پون گھنٹے کا ایک پیریڈ ہوتا ہے اور دو پیریڈز ملا کر ڈیڑھ گھنٹے بنتے تھے۔ اب ڈیڑھ گھنٹہ کرے تو کیا کرے۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے ڈیسک پر اپنا سر رکھ دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد ڈیسک کی سطح پر ایک سایہ سا لہرایا، زینی نے گردن گھما کر دیکھا تو کوئی نہ تھا، اس نے اپنا سر جھٹکا اور بیگ میں اسکیچ بک رکھنے ہی لگی تھی کہ بیگ کی زپ پر ایک بونا بیٹھا نظر آیا۔ اس بونے کی ٹوٹل لمبائی ایک انگلی جتنی تھی، زینی کو پہلے تو یقین نہ آیا، اس نے اپنا سر قریب لے جا کر دیکھا تو وہ واقعی بونا ہی تھا جس نے سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور نیلے رنگ کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گال گلابی اور پھولے پھولے سے تھے، بونے نے جب زینی کو اپنی جانب متوجہ پایا تو بولا:

''اے پیاری لڑکی! اتنا کیا حیرانی سے گھور رہی ہو، بس بھی کر دو، کبھی اتنا ہینڈسم بونا نہیں دیکھا کیا؟'' بونے کی بات سن کر زینی جھینپ گئی اور اپنی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا:

''سنو! تمہارا نام کیا ہے؟ بونے نے اتراتے ہوئے کہا:

''میرا نام ساشا ہے۔''

''زینی نے تجسس سے ایک اور سوال کیا۔

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' بونے نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا:

''ارے بھئی تمہاری دور کی نظر کمزور معلوم ہوتی ہے، بھئی میں بونا ہوں یہ تو ظاہری بات ہے

اور نام میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور یہاں اس ڈیسک کے نیچے میرا پورا شہر آباد ہے۔"

"کیا؟ یہاں اس ڈیسک کے نیچے اور پورا شہر! مطلب کہ اور بھی بونے ہیں یہاں؟"

زینی حیران ہی رہ گئی۔ "بونے نے اس کی حیرانی پر ہنستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی، جیسے ہی دونوں ہتھیلیاں آپس میں ٹکرائیں ایک روشنی سی جگمگائی، زینی نے دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا۔

"اچھا اب اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟" بونے نے زینی سے پوچھا:

"میں؟ میرا نام زینب ہے اور میں اس اسکول میں پڑھتی ہوں۔" ابھی زینی نے اتنا ہی کہا تھا کہ ساشا ایک دم ہی چونک کر سیدھا دیکھنے لگا، زینی نے الجھ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ایک اور ساشا جیسا ہی بونا ڈیسک کے اوپری سطح پر بھاگا بھاگا ساشا کی طرف آ رہا ہے، ساشا اسے دیکھ کر زینی کے بیگ کی جیب میں چھپ گیا، لیکن دوسرا بونا یہ دیکھ چکا تھا، قریب آتے ہی اس نے کہا:

"ساشا باہر آ جاؤ، بس اب بہت ہو گیا، میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔"

"ساشا یہ سن کر بیگ سے باہر آ گیا، زینی نے ساشا سے پوچھا:

"کیا بات ہے ساشا؟ اور یہ کون ہے؟" ساشا نے اپنے پھولے پھولے گالوں والے منہ کو مزید پھلاتے ہوئے کہا:

"یہ میرا دوست ہے، کوکو اور یہ مجھے تم سے بات کرتے دیکھ کر میرے گھر والوں کو بتا دے گا اور پھر سب مجھے ڈانٹیں گے۔"

کوکو نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھمکایا:

"وہ تو میں ضرور بتاؤں گا، تم نے بھی تو میری شکایت لگائی تھی نا!"

زینی نے ساشا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ساشا کہنے لگا:

"ہاں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میری شکایت کرو گے؟"

ارے ارے زینی! نے دونوں سے کہا:

"بھئی یہ کیا بات ہوئی؟ تم دونوں بڑے ہی چغل خور ہو، چلو ایک گیم کھیلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر زینی نے اپنے بیگ سے اسکیچ بک نکالی اور اس پر دوڑ کے میدان جیسی لائنیں کھینچیں۔ "چلو بھئی تم دونوں کی ذرا ریس ہو جائے۔"

یہ سن کر ساشا اور کوکو بھاگ کر لائن پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ زینی کے ایک دو تین کہتے ہی دونوں صفحے کے اختتامی کونے کی طرف دوڑنے لگے۔ آدھا صفحہ ہی طے ہوا تھا کہ ساشا گر پڑا، کوکو اپنی ریس ادھوری چھوڑ کر اسے اٹھانے پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانے لگا، اس چکر میں کوکو کے ہاتھ میں ساشا کی ٹی شرٹ کی آستین آ گئی اور وہ کندھے سے الگ ہو گئی۔ ساشا نے جب اپنی پھٹی ہوئی ٹی شرٹ دیکھی تو کوکو پر پل پڑا۔ زینی اس صورت حال سے بوکھلا سی گئی اور دونوں کو چٹکیوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر کہا:

"تم دونوں تو بالکل ٹام اینڈ جیری کی طرح ہو، دوستی بھی پکی اور لڑے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔" ساشا اور کوکو دونوں نے اپنے کان پکڑتے ہوئے التجا کی:

"اچھا اب نہیں لڑیں گے، ہمیں نیچے تو اتار دو۔" زینی نے دونوں کو ڈیسک پر چھوڑ دیا، دونوں اپنے کپڑے جھاڑنے لگے، زینی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اچھا زینی ایک بات بتاؤ، تمہاری سالگرہ کب آتی ہے؟" کوکو نے اک دم سے سوال کیا۔ زینی نے اُداسی سے جواب دیا:

"ویسے تو بارہ اپریل کو آتی ہے لیکن کوئی مناتا ہی نہیں۔"

"ارے؟ اس میں اداسی کی کیا بات ہے؟ ہم تمہاری سالگرہ ابھی منا لیتے ہیں۔" ساشا نے جوش سے کہا، کوکو نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

"کیسا کیک پسند ہے تمہیں؟ جیسا کہو گی ویسا ہی لا دیں گے؟" زینی نے حیرانی سے پوچھا:

"کیک کہاں سے لاؤ گے تم؟" ساشا اور کوکو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگے اور ساتھ ساتھ گانے لگے۔

"سالگرہ منانے آئے ہیں، خوشیاں ساتھ لائے ہیں، کیک نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم جادو سے کیک لائے ہیں۔" ان کے یہ کہتے ہی ڈیسک پر ایک خوبصورت سا چاکلیٹ آ گیا جس پر بہت ہی پیاری پری کی شکل کی موم بتی لگی ہوئی تھی، زینی نے اپنی کلاس کی طرف دیکھا، ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مگن تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، کوئی ڈرائنگ کر رہا تھا تو کوئی اپنا ہوم ورک مکمل کر رہا تھا۔ ساشا اور کوکو نے زینی کے چہرے پر آئی پریشانی کو پڑھ لیا اور ایک بار پھر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گول گول گھومتے ہوئے رقص کرنے لگے۔

"چاند سے آئے ہم سالگرہ منانے، پوری کلاس کو بلاتے ہیں سالگرہ منانے، سر آپ کیوں نہ آئیں گے؟" "ہم آپ کو بھی ہیں بلاتے سالگرہ منانے۔" جیسے ہی انہوں نے یہ منتر مکمل کیا پوری کلاس "برتھ ڈے ٹو یو" گانے لگی۔ سر ناصر جو ابھی کمرے میں واپس آئے ہی تھے زینی کی طرف چلے آئے اور تالیاں بجانے لگے۔ زینی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی، تالیوں کی آواز بڑھتی جا رہی تھی ساشا اور کوکو دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک دھواں سا کلاس میں بھر گیا تھا، سر کی تالیاں اور تیز ہوتی گئیں، دھواں زینی کی آنکھوں میں جانے لگا۔ زینی نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسل کر پھر سے دیکھنے کی کوشش کی تو سر اسے اپنے ڈیسک کے پاس تالی بجاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اٹھو زینی، اٹھو!" زینی نے بے ساختہ کہا:

"سر! میری سالگرہ منائی جا رہی ہے، میں کہاں سو رہی ہوں؟" اب کہ سر ناصر زور سے ہنس پڑے اور زینی کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا:

بقیہ صفحہ نمبر: 59

بصارت سے محروم افراد کے لیے عالمی دن پر خصوصی تحریر

وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

عائشہ اے بٹ

اُس کی آنکھیں روشنی سے محروم تھیں لیکن اُس کا دل وطن کی محبت سے روشن اور سرشار تھا۔

''اسد علی! سب سامان تیار ہے بیٹا آجاؤ میں چھوڑ آؤں'' اسد علی کی ماں نے اُسے کہا۔

''جی امّی چلیے'' اُس نے اپنی سفید چھڑی تھامی اور ماں کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اسد علی کی ماں ریڑھی تک پہنچی ہاتھ میں اسد علی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ دونوں ماں بیٹا ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

دس افراد کا یہ خاندان شدید مالی مشکلات کا شکار تھا جب سے اسد علی کے والد فالج کا شکار ہو کر بستر سے جا لگے تھے۔ چھے بہن، بھائی بوڑھے دادا، دادی اور گھریلو اخراجات کا انبار۔ جب نوبت فاقوں تک آ پہنچی تو ماں، بیٹے نے فیصلہ کیا کہ سموسوں اور چپس کی ریڑھی لگا لی جائے۔ اسد علی کی والدہ کھانے پکانے میں ماہر تھی۔ مسئلہ بس ایک ہی تھا کہ کیا اسد علی کامیابی سے سموسے اور چپس فروخت کر پائے گا کیونکہ اسد علی بینائی سے محروم تھا۔ ریٹ لسٹ ریڑھی کے اُوپر لگا دی گئی تھی۔ اس کی ماں چھٹی سے کچھ دیر پہلے سموسے اور چپس تل کر رکھ دیتی تھی جو اسد علی بیچتا تھا۔ اللہ نے اُسے ایک نعمت سے محروم رکھا تھا تو دوسری بہت سی نعمتوں سے نوازا بھی تھا۔

وہ بہت جلد کچھ بھی سیکھ جاتا تھا اور اپنا کام پوری مہارت سے کرتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی معروف سکول کے سامنے اپنی ریڑھی لگا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی سکول کی چھٹی کی گھنٹی بجتی اور بچے سکول سے باہر آنا شروع ہوتے تو سکول کے باہر دور دور تک چپس اور سموسوں کی خوشبو پھیلی ہوتی اور بچے سکول سے نکلتے ہی اسد علی کی ریڑھی کے گرد اکھٹے ہو جاتے۔ بہت سے بچے تو اسد علی کے دوست بھی بن چکے تھے۔

''اسد علی! سچ بتاؤ اُونچا سنتے ہو یا ڈرامہ کرتے ہو؟ سفیان نے بہت آہستہ آواز میں پوچھا۔ اسد علی سکون سے پلیٹ میں سموسے ڈال کر بوتل سے چٹنی ڈالتا رہا۔''

''بے وقوف! اگر وہ سچ میں سنتا ہوتا تو ری ایکٹ کرتا'' عالی نے سفیان سے کہا۔

''یار سچی! مجھے لگتا ہے یہ جان کر ظاہر کرتا ہے کہ اسے اُونچا سنائی دیتا ہے'' سفیان بضد تھا۔

''تمہارا کیا ہے تھوڑی دیر میں کہو گے کہ اسد علی کو نظر بھی آتا ہے سفید چھڑی بھی وہ شوق سے پکڑتا ہے'' عالی نے ہنس کے قدرے اُونچی آواز میں کہا۔ اسد علی ہنس پڑا۔

''سفید چھڑی کون شوق سے پکڑتا ہے عالی'' اسد علی کی مسکراہٹ میں افسردگی تھی۔'' وہ اُونچا نہیں سنتا تھا لیکن جب سب یہ سمجھ کر کے وہ اُونچا سنتا ہے سرگوشیوں میں

اُس کی تعریف کرتے تو اُسے اچھا لگتا۔ اسی لیے اُس نے یہ غلط فہمی کہ وہ اُونچا سنتا ہے کبھی دور کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

''یار پانچ درجن سموسے تلے بغیر دے دو ماما نے کہا تھا کہ زیادہ لانا بہت ہی مزے کے ہیں۔ گھر شام کو مہمان آرہے ہیں تو اُن کو بھی کھلائیں گے'' عالی نے اپنا آڈر دیا۔

گھر کے حالات کچھ بدل گئے تھے وہ گھر جہاں دس افراد فاقہ کر رہے تھے اب دو وقت کھانا کھا رہے تھے اور یہ سب اسد علی اور اُس کی ماں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ لوگ دور دور سے اسد علی کے سموسے اور چپس کھانے آتے۔ زیادہ تر لوگ تو واقعی سموسوں اور چپس سے لطف اندوز ہونے آتے تھے اور کچھ یہ دیکھنے آتے تھے کہ ایک بینائی سے محروم بچہ کس طرح سموسے اور چپس بنا کر بیچ لیتا ہے۔ اسد علی جس جگہ ریڑھی لگاتا تھا اُس کے پیچھے ایک بہت بڑا میدان تھا۔ جہاں چھٹی کے دن بچے کبھی کرکٹ اور کبھی ہاکی کھیلتے تھے۔ وہ بھی ایک گرم دن تھا سکول کی چھٹی ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اسد علی نے سکول کے چوکیدار کو آواز دی:

''خان بھائی! کتنا وقت رہ گیا چھٹی میں؟

''ایک گھنٹہ ہے ابھی'' چوکیدار نے بھی دور سے ہی قدرے اُونچی آواز میں جواب دیا۔ اسد علی جلدی جلدی سموسوں کے لیے لفافے تیار کرنے لگا جب اُسے فضا میں عجیب سی بدبو محسوس ہوئی۔

''کون ہے؟'' ''کون ہے اُدھر؟'' اسد علی نے پیچھے مڑ کے پوچھا۔

''کیا مسئلہ ہے، تمہیں؟'' کرخت آواز اُبھری اسد علی خاموش کھڑا رہا۔ پھر بولا:

''کون ہے؟''

''ارے لڑکے! کیا ہے؟'' کرخت لیکن پہلے سے بلند آواز اُبھری۔

''لگتا ہے اُونچا سنتا ہے'' وہی آواز پھر بولی۔

''یہاں سگریٹ مت پیو پرنسپل صاحب نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔ سکول کے اردگرد منع کر رکھا ہے'' اسد علی نے اطلاع دی۔

''اوجا، جا دیکھ لیں گے تیرے پرنسپل کو سگریٹ ہی پی رہے ہیں کونسی توپ چلا رہے ہیں۔'' آواز دوبارہ اُبھری۔ عجیب بدبو تھی سگریٹ کی انتہائی ناگوار۔ اسد علی کمر موڑ کر دوبارہ سے چٹنی ڈالنے لگا۔

پھر یہ روز کا معمول ہی بن گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیتے اسد علی سے سموسے، چپس لے کر کھاتے اور چلے جاتے۔ اُس دن بھی اُن کے سگریٹ کی مخصوص بدبو اسد علی کو بہت ناگوار لگ رہی تھی۔ مگر وہ اُن کو کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔

''پیر کا دن ٹھیک ہے'' اسد علی کے پیچھے آواز اُبھری۔

''آہستہ بولو سن لے گا''

''کیسے سنے گا؟ اُونچا سنتا ہے'' دوسری آواز اُبھری۔

''یہ چور ہیں لگتا ہے میرے پیسے اُڑانا چاہتے ہیں۔'' اسد علی کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ اگلا دن اتوار کا تھا۔ سارا دن وہ یہی سوچتا رہا کہ ماں کو بتائے یا نہ بتائے اور بتائے بھی تو کیا کہ: ''پیر کا دن ٹھیک رہے گا۔'' رات نیند سے بوجھل آنکھیں بند کرتے ہوئے بھی اُس کے دماغ میں ایک ہی بات تھی کہ پیر کا دن کس لیے ٹھیک رہے گا؟

اگلے دن جب وہ سکول کے سامنے پہنچا تو اُس کے پیچھے کوئی مخصوص بدبو نہیں تھی وہ دونوں نہیں آئے تھے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

''میں وہم پال رہا تھا'' وہ سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔ اگلے دن اسد علی جب اپنی مخصوص جگہ پر پہنچا تو وہ دونوں وہاں پہلے سے موجود تھے مخصوص ناگوار بدبو نے اسد علی کا استقبال کیا۔ اسد علی کا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا۔ اُس کے پاس جتنے بھی پیسے تھے اُس نے جلدی سے ریڑھی پر بچھی پلاسٹک کی شیٹ کے نیچے چھپا دیے۔ آلو کاٹنے والی چھری کو اُس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''اس چھری سے کیا ہوگا؟ اس سے تو آلو بھی ٹھیک سے نہیں کٹتے'' اُس نے چھری واپس رکھ دی۔

''بٹن کو ہاتھ سے دور رکھو ورنہ یہیں اُڑ جائیں گے'' اسد علی کے پیچھے آواز اُبھری۔

''کتنے بچے ہوں گے اندر؟''

''پانچ ہزار سے کم نہیں'' دوسری آواز اُبھری۔

اسد علی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''یہ دہشت گرد ہیں۔ سکول کے بچوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔'' اسد علی کی ماں۔ کچھ ہی دیر پہلے سموسے اور چپس تل کر گئی تھی۔

''لفاں بھی چلی گئی۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھا۔

''خان کو بتاتا ہوں۔''

''خان، خان'' وہ چلایا سکول کا چوکیدار شاید گیٹ کے اندر کسی کام سے گیا تھا۔ اسد علی کی آواز پر خاموشی تھی۔

''یہ بدبخت کیوں چلا رہا ہے'' اسد علی کے پیچھے آواز اُبھری۔

''کہیں سن تو نہیں لیا سب، میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ اُونچا نہیں سنتا'' اسد علی کے پیچھے پریشان آواز اُبھری، اسد علی نے چھری پکڑی اور سکول کی جانب بڑھنے لگا۔

''یہ چوکیدار کو بلانے جا رہا ہے پکڑو اسے'' آواز اُبھری۔

''سارا کام بگاڑ دے گا۔'' وہ دونوں اسد علی کی طرف لپکے۔

''کیا کروں؟'' بے بسی کی انتہا تھی۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آیا ریڑھی پر پانی والا سٹیل کا خالی جگ پڑا تھا اُس نے کڑاہی میں ڈالا اور گرم تیل جگ میں بھر لیا۔ دونوں آوازیں

بقیہ صفحہ نمبر: 07

آخر وہ کون سی پراسرار مخلوق تھی جس نے چچا جان بہادر جیسے نڈر انسان کو ڈرا دیا؟ یہ وہ راز تھا جسے سب جاننا چاہتے تھے مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب بہن بھائی انہیں چچا جان بہادر کہتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے اور چند ماہ کے بعد شہر کا چکر ضرور لگاتے۔ ابو کے بچپن کے دوست اور دلچسپ انسان تھے۔

جب بھی آتے ہر بار ایک نیا واقعہ سناتے تھے۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب ہی ان کے منتظر رہتے تھے۔ پچھلی دفعہ جب وہ ہمارے ہاں آئے تو حیران کن طور پر وہ ان کا آخری چکر ثابت ہوا۔ ان کی شہر آمد کی خبر سن کر سب بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ شام سے کچھ پہلے وہ تشریف لے آئے۔ ہمیشہ کی طرح اوپر والا کمرا انہیں دیا گیا۔ کھانے کے بعد حسب معمول گپ شپ کا دور شروع ہوا۔

پچھلی ملاقاتوں میں ہم ان کی مختلف مہمات کے واقعات سن چکے تھے۔

''چچا! جن بھوتوں سے کبھی آپ کا واسطہ پڑا؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''اچھا سوال کیا ہے تم نے۔ ایک بار نہیں کئی بار میرا سامنا جنوں اور بھوتوں سے ہوا ہے۔ دراصل میں بھی تم لوگوں کو آج ایسے ہی دو واقعات سنانے والا ہوں۔ میری چھوٹی بہن کا گھر دور دراز ایک گاؤں میں ہے۔ وہ سرحدی علاقہ ہے۔ ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تو واپسی پر دیر ہو گئی۔ بہن اور بہنوئی نے اصرار کیا کہ میاں رک جاؤ رات ہمارے ہاں بسر کرو اور صبح چلے جانا۔ راستہ ویران ہے اور رات کو جنات کا ڈر ہوتا ہے، مگر میں ان کی ایک نہ مانا اور مسکرا کر کہا:

''میں خود جنوں سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔'' خیر انہوں نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور میں اپنے گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔''

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں آبادی سے دور ویران علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ وقفے وقفے کے بعد دور کہیں سے آنے والی گیدڑوں کی آوازیں خاموشی کو توڑ رہی تھیں، مگر میں سب سے بے نیاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

آگے ایک خشک نالہ تھا۔ جب میں نالے کے درمیان پہنچا تو جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔ بتیاں جل رہی تھیں اور ناچ گانا شروع تھا۔ قریب ہی انواع واقسام کے کھانوں کی دیگیں پک رہی تھیں۔ میں نے پاس سے گزر جانے میں عافیت جانی مگر اچانک کسی نے میرا نام پکارا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک جھرجھری سی بدن میں سرایت کر گئی۔ تاہم اگلے ہی لمحے میں نے اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے خود پر قابو پا لیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ رات گئے آبادی سے دور یہ شادی کس کی ہو سکتی ہے؟ اور یہ لوگ میرے جاننے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ اتنے میں دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ میں بھی ناچ گانے میں شریک ہو گیا۔ دولہے کا باپ دلیے میں میری

شرارتی پردے

حسن اختر

شرکت پر بہت خوش ہوا۔ دیر تک محفل جمی رہی۔

''اس کے بعد کھانا شروع ہوگیا۔ باورچیوں نے خوش ذائقہ کھانے بنائے تھے۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ لوگ گھروں کو جانے لگے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دلہے کے باپ نے گھر کے لیے ایک برتن میں کھانا ڈال کر مجھے تھما دیا۔ جب میں گھر پہنچا تو سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں نے کھانے کا برتن سنبھال کر رکھ دیا اور اپنے بستر پر سو گیا۔

صبح اٹھ کر جب میں نے دعوت والا کھانا گرم کرنے کی غرض سے برتن کھولا تو کھانے کی بجائے ہڈیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے والد صاحب سے اس واقعے کا ذکر کیا تو سارا معاملہ سمجھ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ دراصل وہ جنوں کی برات تھی جس میں تم نے شرکت کی۔ انہوں نے انسانی روپ دھار رکھا تھا۔ تمہاری عقل تسلیم کرتی ہے کہ رات گئے ویرانے میں انسانوں کی برات ہو سکتی ہے؟ وہ جن ہی تھے جو تمہارا نام جانتے تھے۔ انہوں نے تمہیں گھر کے لیے کھانے کا جو برتن دیا۔ اس میں سے ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں دراصل یہ جنوں کی من پسند خوراک ہے۔''

ہم سب چچا جان بہادر کی آپ بیتی بغور سن رہے تھے۔ چھوٹی نیہا بول پڑی۔

''چچا چچا! جنوں نے آپ کو جو ہڈیاں کھلائیں وہ حلق میں پھنسی نہیں؟'' نیہا کے اس معصومانہ مگر معنی خیز سوال پر سب نے قہقہہ لگایا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے۔ گلے میں تو نہیں پھنسیں مگر ہضم بھی نہیں ہوئیں۔ کھاتے وقت وہ عام کھانے کی حالت میں تھیں، مگر دوسرے دن مجھے معدے میں تکلیف شروع ہو گئی۔ بھلا ہو حکیم صاحب کا جنہوں نے میرا علاج کیا اور اس بلا سے جان چھوٹی۔'' چچا جان بہادر کے اس جواب نے سب کو حیران کر دیا۔

اس واقعے پر کافی دیر تک تبصرے ہوتے رہے۔ گپ شپ میں پتا نہ چلا۔ خاصی دیر ہوگئی تو چچا نے کل رات کو ایک اور دلچسپ داستان سنانے کا وعدہ کیا اور سونے کی اجازت لی۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ ابھی لیٹے ہی تھے کہ اوپر والے کمرے سے چچا جان بہادر کی فلک شگاف چیخ سنائی دی۔ ہم سب بہن بھائی اور امی ابو اوپر پہنچے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور بلب بند تھا۔ سرفراز نے موبائل کی ٹارچ کی مدد سے بٹن آن کیا۔ ہم نے دیکھا کہ چچا جان بہادر بے ہوش پڑے ہیں اور ان کا جسم پسینے سے شرابور ہے۔ ابو نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب پہنچ گئے۔ معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے کہا خطرے کی کوئی بات نہیں انہیں نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہم کی وجہ سے ڈر گئے ہیں۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ دروازہ کھلا تھا ورنہ نقصان ہو سکتا تھا۔ ابو نے رات چچا کے پاس گزاری صبح نیند سے بیدار ہوئے تو چچا نے بتایا:

''کہ تم لوگوں کے جانے کے بعد جیسے ہی میں سونے کے لیے لیٹا دو جن آ گئے ایک نے مجھے پاؤں سے پکڑا اور دوسرے نے میری گردن دبا دی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔''

''اس کے بعد چچا تو چلے گئے مگر ہم لوگوں کے لیے ایک معما چھوڑ گئے۔ ابو جو اکثر اسی کمرے میں سوتے تھے کافی پریشان تھے۔ میں نے ہمت کرتے ہوئے ان کے ساتھ سونے کی ہامی بھری، چنانچہ اگلی رات جیسے ہی ہم بلب بند کر کے سونے کے ارادے سے لیٹے ابو کا قہقہہ بلند ہوا اور ساتھ ہی کہنے لگے جن پکڑے گئے۔ میں اپنے بستر میں سہما ہوا تھا۔ ابو نے خود ہی اٹھ کر لائٹ آن کی میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا لیکن کوئی جن دکھائی نہیں دیا تھا، البتہ دیواروں کے ساتھ لٹکے دو پردے پنکھے کی ہوا میں جھوم جھوم کر ابو کی چارپائی کو چھو رہے تھے۔ دراصل کل شرارت انہی پردوں کی تھی۔ چچا جان بہادر اندھیرے میں پردوں جن سمجھ بیٹھے تھے۔ صبح ناشتے کی میز پر گھر کے باقی افراد کے سامنے ذکر کیا تو سب خوب ہنسے۔ وہ دن اور آج کا دن چچا جان بہادر ہمارے گھر تو دور شہر میں بھی نہیں آئے۔'' ☆

''کیا منو میرے بارے میں ایسا کہہ سکتا ہے؟''

''اب میں نے جو دیکھا سنا وہ تمہیں بتا دیا، باقی وہ دیکھو تمہارا دوست منو آ رہا ہے تم خود اس سے پوچھ لو۔'' پُو منو کو آتا دیکھ کر اڑ گیا اور چھپ کر ان دونوں کی لڑائی دیکھنے لگا۔

''منو کیوں آئے ہو یہاں؟ مجھ سے دوستی ختم کرنے۔ اگر دوستی ختم کرنے آئے ہو تو تم سے پہلے میں تم سے دوستی ختم کرتا ہوں کیوں کہ مجھے تم جیسا دوست نہیں چاہیے جو منہ پہ میرا اور پیٹھ پیچھے میری برائی کرتا پھرے، ہونہہ۔'' منو کے آتے ہی چنو نے اس پر غصہ نکالا۔

''واہ! پُو تم نے تو کمال کی لڑائی کرا دی ان دونوں کی۔'' چنو منو کی لڑائی دیکھ کر پُو بڑبڑایا تبھی اسے اپنے پیچھے کسی کی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ہوشیار بُدبُد کھڑا تھا۔

''پُو بچے! چنو منو کی لڑائی تم نے کرائی ہے، نا۔'' ہوشیار بدبد کے پوچھنے پر پُو نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

''آپ کو پتا ہے اللہ تعالیٰ فسادیوں سے محبت نہیں کرتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 1 میں فرماتا ہے:''

''زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔''

''کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ سے محبت نہ کرے؟ اگر نہیں تو پھر چنو منو کو جا کر ساری بات بتا دو اور ان سے معافی مانگو۔ وہ دونوں بہت اچھے ہیں، آپ کو معاف کر دیں گے۔''

''سوری بُدبُد انکل! میں ابھی چنو منو کو جا کر سوری کہتا ہوں اور آئندہ کسی کی بھی لڑائی نہیں کرواؤں گا۔ پُو کی بات سن کر ہوشیار بُدبُد نے اسے شاباش دی اور اپنے گھر روانہ ہو گیا جبکہ پُو، چنو منو سے معافی مانگنے چلا گیا۔ ☆

مستقبل

قیصر جہاں

ارضِ مقدس سب سے پیاری
اس کا پرچم چاند ستارا

اس کے دکھ کو ساتھی سمجھیں
ہر مشکل میں تن من واریں

علم و فن کا زینہ، زینہ
رستہ یہ سب کو دکھلائیں

دل کا آنگن سب کا گھر ہو
ہم بھی مانیں اور منوائیں

جھلمل جھلمل اس کا آنچل
دامن میں اس کے چھپ جائیں

قوسِ قزح کے منظر میں ہم
ساون رت کے نغمے گائیں

رستے رستے پھول کھلیں گے
ہر سو خوشبو پھیلی ہو گی

کتنا اچھا ہو گا وہ دن
ایسا دن جب آ جائے گا

شیف ثانی

ہریالی پراٹھا اور ہریالی چٹنی

صائمہ مسلم

آج شیف ثانی لائی ہیں آپ سب کے لیے ہریالی پراٹھا اور ہریالی چٹنی۔

اجزا

ایک پاؤ	آلو	چار عدد	موٹی ہری مرچ
ایک پاؤ	دہی	چار عدد	چھوٹی ہری مرچ
ایک پاؤ	آٹا	پانچ عدد	لہسن کے جوئے
آدھی گڈی	دھنیا	ایک چٹکی	اجوائن
آدھی گڈی	پودینہ	نمک	حسب ذائقہ
		گھی	حسب ضرورت

ترکیب

آلو اچھی طرح چھیل کر دھولیں۔

ایک پین میں اتنا پانی ڈالیں کہ آلو اچھی طرح ڈوب جائیں۔

ڈھکن رکھ کر تیز آنچ پر پانی اُبلنے دیں۔

پانی اُبل جائے، آنچ درمیانی کردیں اور بار بار چیک کریں۔ (آلو ڈھک کر اُبلنے سے گیلا نہیں ہوتا) آلو اچھی طرح اُبل جائے تو اسے نکال کر پیس کریں۔ (آلو سارے نکالنے تک چولہا جلتا ہی رکھیں۔)

آلو اچھی طرح پیس لیں، ٹھنڈا ہونے پر فریج میں رکھ دیں۔

دھنیا، پودینہ، لہسن، اجوائن، ہری چھوٹی اور موٹی مرچیں اچھی طرح پیس لیں۔

پانی ضرورت پڑے تو تھوڑا سا ڈال لیں۔ سل بٹے پر بھی پیس سکتے ہیں۔

دھنیا پودینہ کی چٹنی کو آدھا کرلیں۔

آدھی چٹنی کو چھلنی یا باریک کپڑے سے چھان لیں۔

آلو میں چھنی ہوئی چٹنی اور حسب ضرورت نمک ملا لیں پھر اچھی طرح ہاتھ سے میش کرلیں۔

ملا کے دوبارہ فریج میں رکھ دیں۔

دہی اچھی طرح پھینٹ لیں۔

باقی آدھی چٹنی اور نمک دہی میں ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔

آٹا نیم گرم پانی سے گوندھ لیں۔

گوندھے ہوئے آٹے پہ ذرا سا گھی لگا کر دوبارہ گوندھ لیں۔

دس منٹ کے لیے گوندھے ہوئے آٹے کو صاف کپڑے سے ڈھک دیں۔

آٹے کا پیڑا بنائیں اور انگوٹھے کی مدد سے بیچ میں جگہ بنالیں۔

پیڑے کے بیچ میں آلو کا پیسٹ بھر لیں۔

(پیسٹ اتنا بھریں کے پیڑا دوبارہ بن سکے)

دس منٹ بعد آلو کے پیڑے کو آرام آرام سے بیل لیں۔

گرم توے پر ڈال دیں۔

جب پراٹھا پلٹیں پھر گھی ڈال کر اچھی طرح تل لیں۔

(چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر تھوڑا تھوڑا بیل لیں۔ پھر ایک پیڑے پر آلو کا پیسٹ ڈال کر دوسرا بیلا ہوا پیڑا رکھ کر دبائیں اور پھر دونوں کو بیل کر ہاتھوں سے بڑا کر لیں۔ اور توے پر ڈال کر تل لیں۔)

گرم گرم ہریالی پراٹھے ہریالی دہی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

بچوں کی من پسند اور ہر دل عزیز ریسپی ہے۔

ماخوذ

چالاک سرمان

آمنہ ارشد

بھارت کے ایک دور دراز گاؤں میں ہری سرمان نامی ایک شخص رہتا تھا۔ اس گاؤں کے سب ہی رہنے والے انتہائی غریب تھے اور محنت مزدوری کر کے بمشکل اپنا پیٹ پالتے۔ ہری سرمان پر اپنے بیوی بچوں کو پالنے کی ذمہ داری تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اور اس کی بیوی ودیا دونوں ہی انتہائی سست اور کاہل تھے۔ نہ وہ خود کوئی کام کرتے اور نہ ہی انہوں نے اپنے بچوں کو کسی کام کی عادت ڈالی تھی۔ اگر گاؤں کے باقی لوگ ان کی مدد نہ کرتے تو وہ سب کے سب بھوکے مر جاتے۔ ہری سرمان روزانہ اپنے بچوں کو بھیک مانگنے یا چوری کرنے کی غرض سے مختلف جگہوں پر بھیجا کرتا تھا جب کہ وہ اور ودیا گھر پر فارغ بیٹھے رہتے۔

ایک دن وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا:

''ایسا کرتے ہیں کہ گاؤں چھوڑ کر کسی بڑے شہر میں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں ہمارا بہتر گزارا ہو سکے۔ میں ایک ہوشیار شخص کا روپ دھاروں گا جو جادوئی علم کے ذریعے رازوں کے سراغ لگانا جانتا ہو۔ اور تم یہ ظاہر کرنا کہ تمہیں گھریلو امور میں مہارت حاصل ہے۔'' ودیا فوراً ہی آمادہ ہو گئی اور سب گھر والے اپنا تھوڑا بہت سامان اٹھا کر گاؤں سے نکل کھڑے ہوئے۔

آخر کار ان کا پڑاؤ ایک بڑے شہر میں ہوا۔ ہری سرمان نے وہاں کے سب سے بڑے تاجر کے گھر کا رخ کیا۔ اپنے بیوی بچوں کو باہر انتظار کرنے کا کہہ کر اس نے باہر کھڑے چوکیدار سے گھر کے مالک سے ملنے کی درخواست کی۔ گھر کا مالک ایک نہایت کامیاب تاجر تھا۔ پورے ملک میں اس کی بہت سی جائیدادیں تھیں لیکن شاید وہ اتنا سمجھدار نہ تھا کیونکہ وہ ہری سرمان کی خود ساختہ کہانی سننے کے بعد فوراً ہی اسے بیوی بچوں سمیت رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ اپنی باتوں سے امیر تاجر کو قائل کر لینے پر ہری سرمان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ بھاگتا ہوا باہر آیا تاکہ اپنی بیوی کو یہ خوشخبری سنا سکے۔ دونوں میاں بیوی کو گھر کے اندر ہی رہائش کے لیے ایک کمرا دے دیا گیا جب کہ بچوں کو قریبی ادارے بھیج دیا گیا تاکہ وہ کوئی ہنر سیکھ سکیں۔

انہیں یہاں رہتے کچھ ہی روز گزرے تھے کہ تاجر کی اکلوتی بیٹی کی شادی تقریبات آ گئیں۔ شادی کی تیاریوں میں ودیا نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دن کا زیادہ تر حصہ وہ باورچی خانے میں گزارتی جہاں وہ مختلف قسم کے پکوان تیار کرنے میں نوکروں کی مدد کرتی۔ اس طرح اس کے بھی مزے ہو گئے۔ ہر روز نت نئے پکوان کھانے کو ملتے۔ اس گھر میں نوکروں کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا اسی لیے ودیا بہت خوش تھی۔ ایسی زندگی اس نے پہلے

کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب اسے اپنے بچوں کی پرورش میں غفلت برتنے پر افسوس ہونے لگا۔

''ایک بار شادی کی تقریبات ختم ہو جائیں تو میں جا کر بچوں سے ملوں گی اور دوبارہ کبھی انہیں اپنی توجہ سے محروم نہیں کروں گی۔'' لیکن اب وہ ہری سرمان کی طرف سے غافل ہونے لگی تھی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ ہری سرمان کو اپنا آپ ناکارہ لگنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر وہ ودیا کی دیکھا دیکھی باورچی خانے کا رخ کرتا تو نوکر اسے یہ کہہ کر باہر نکال دیتے کہ تمہارا یہاں کیا کام۔ خود تاجر بھی اسے گھر میں رکھ کر فراموش کر چکا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اسے نوکروں جتنی اہمیت بھی حاصل نہ تھی۔ وہ اس صورتحال کو بدلنا چاہتا تھا۔ ودیا شادی کے ہنگاموں میں اس قدر مصروف تھی کہ اسے اپنے شوہر کا خیال تک نہ آیا۔

''آخر میں ایسی کیا چال چلوں کہ گھر کے مالک کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے؟'' وہ اکثر سوچتا۔ ایک روز اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''ایسا کرتا ہوں کہ میں یہاں کی کوئی قیمتی چیز چھپا دیتا ہوں اور جب کوئی بھی اسے ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوگا تو مالک کو میرا ہی خیال آئے گا۔''

یہ خیال آتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

تاجر کا ایک اصطبل تھا جہاں بہت سے خوبصورت اور قیمتی گھوڑے رکھے گئے تھے جن کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اُن ہی گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا عربی نسل کا تھا جو تاجر کی بیٹی کا پسندیدہ گھوڑا تھا۔ سرمان نے ایک منصوبہ بنایا کہ

''اس گھوڑے کو میں جنگل میں کہیں چھپا آؤں گا اور جب یہ کہیں سے نہیں ملے گا تو مالک کو یقیناً میری ضرورت پڑے گی۔ واہ! کتنا ہوشیار ہوں نا میں'' دل ہی دل میں منصوبہ بندی کرتے ہوئے وہ خود کو داد دینے لگا۔

رات ہوتے ہی وہ دبے پاؤں اٹھا اور اصطبل جا پہنچا۔ حسب توقع وہاں کوئی نہ تھا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے اصطبل کا دروازہ کھولا اور عربی نسل کے اس گھوڑے کو باہر نکال لایا۔ گھوڑے کو ہمیشہ اتنے پیار سے رکھا گیا تھا کہ اس نے بھی کوئی مزاحمت نہ کی اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ جنگل میں گھنے درختوں کے درمیان پہنچ کر اس نے گھوڑے کو مضبوطی سے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور خود خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔

اگلی صبح تاجر کی بیٹی حسب معمول اپنی خادمہ کو ساتھ لیے اپنے چہیتے گھوڑے کو دیکھنے گئی۔ اسے اصطبل میں نہ پا کر وہ حواس باختہ ہوگئی اور بھاگم بھاگ اپنے باپ کو خبر دینے گئی۔ یہ خبر سن کر تاجر گھوڑوں کے رکھوالوں پر برہم ہونے لگا۔ اس نے فوراً ہی منادی کرا دی کہ جو بھی گھوڑے کو ڈھونڈ کر لائے گا اسے بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ گھوڑے کی گمشدگی کی خبر ودیا تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اس کا پہلا شک ہری سرمان پر ہی گیا۔

''ہو سکتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر گھوڑے کو غائب کیا ہو تاکہ اسے ڈھونڈ کر لانے کے بدلے اسے کوئی انعام مل سکے۔'' اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ وہ اپنے شوہر کی فطرت سے خوب واقف تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے گھر کے مالک سے ملنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملتے ہی وہ تاجر سے کہنے لگی:

''اس معاملے میں آپ میرے شوہر کی مدد کیوں نہیں لیتے؟ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ رازوں کا سراغ لگانا خوب جانتا ہے۔ کئی بار تو اس نے مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔''

ودیا کی بات سنتے ہی تاجر نے اسے فوراً ہری سرمان کو بلا کر لانے کو کہا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ہری سرمان نے آنے سے انکار کر دیا۔

''تم واپس جا کر مالک سے جو مرضی کہہ دو۔ میں نہیں آؤں گا۔ اب تک تم سب مجھے بھلائے بیٹھے تھے۔ اب کام پڑا ہے تو میری یاد آئی۔ اب میں بھی نہیں آؤں گا۔'' وہ غصے سے چلانے لگا۔ ودیا نے اسے منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی بھی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر کار ناکام ہو کر ودیا واپس گئی اور تاجر کو ہری سرمان کے نہ آنے کی وجہ بتائی۔

''ہاں وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔'' خلاف توقع تاجر بالکل بھی ناراض نہیں ہوا۔

''میں نے بھی اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس سے جا کر کہو کہ میں اپنے رویے پر نادم ہوں اور اگر وہ میری مدد کرتا ہے تو میں اسے اس کی سوچ سے بڑھ کر نوازوں گا۔''

یہ سن کر ہری سرمان آ گیا لیکن اپنی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں اتنا بڑا جادوگر ہوں۔ یہاں میری صلاحیتوں کو سراہا نہیں گیا۔''

''میں جانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی لیکن ابھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' تاجر نرمی سے بولا۔

ہری سرمان جان گیا تھا کہ یہ ہی درست موقع ہے۔ اس نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نقشہ برآمد کیا جس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ نقشے کو تاجر کے سامنے پھیلا کر وہ ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہنے لگا:

''میرا علم کہتا ہے کہ جنگل میں ان درختوں کے آس پاس آپ کو اپنا گھوڑا مل سکتا ہے۔''

اس کی یہ بات سنتے ہی تاجر خوش ہو گیا۔ اس نے فوراً جنگل کی طرف اپنے آدمی دوڑائے جو جلد ہی گھوڑے کو لے کر واپس آ گئے۔

اس واقعہ کے بعد سب پر ہری سرمان کی صلاحیتوں کا خوب رعب پڑ گیا۔ اس کی خوب خاطر تواضع ہونے لگی۔ اب اسے بھی کسی سے کوئی شکایت نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ سب ٹھیک چلتا رہا لیکن قسمت زیادہ دیر اس پر مہربان نہ رہی۔

ایک روز بادشاہ کے محل سے قیمتی زیورات غائب ہو گئے۔ کسی نے بادشاہ کو بتایا کہ ہری سرمان نامی ایک شخص ہے جس نے جادوئی علم کے ذریعے ایک امیر تاجر کا گمشدہ گھوڑا

برآمد کروایا تھا۔

''اس شخص کو فوراً یہاں لے آؤ!'' بادشاہ نے حکم جاری کیا۔

جب ہری سرمان کو پیش کیا گیا تو بادشاہ کہنے لگا:

''میں نے سنا ہے کہ تم جادوئی علم کے ذریعے سراغ لگانا جانتے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ محل سے قیمتی زیورات کس نے چوری کیے اور اب کہاں سے ملیں گے؟''

بیچارے ہری سرمان کی تو جان پر بن گئی۔ اب وہ زیورات کا سراغ کہاں سے لگاتا۔ آخر کار ہمت کر کے وہ کہنے لگا۔

''بادشاہ سلامت! مجھے کل تک کا وقت دیجئے تاکہ میں اپنے علم کے ذریعے سراغ لگا سکوں۔''

''میں تمہیں ایک گھنٹہ بھی نہیں دے سکتا۔'' اپنے سامنے ہانپتے کانپتے ہری سرمان کو دیکھ کر بادشاہ کو شک گزرا۔

''اگر تم واقع اس علم سے واقف ہو تو تمہیں فوراً مجھے بتا دینا چاہیے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں قید خانے میں ڈلوا دوں گا۔''

یہ سنتے ہی ہری سرمان مزید خوفزدہ ہو گیا۔ وہ کسی طرح بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے کچھ مہلت مل سکے۔

''حضور! دنیا کے بہترین جادوگروں کو بھی بڑے بڑے رازوں کے سراغ لگانے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ مجھے بس چوبیس گھنٹے دے دیجئے۔ میں آپ کو چوروں کا پتہ بتا دوں گا۔''

''اگر تم اتنی سی بات کا جواب نہیں دے سکتے تو تم مجھے کہیں سے بھی جادوگر نہیں لگتے۔'' یہ کہتے ہی بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے جیل میں ڈال دیا جائے اور جب تک وہ کچھ اگلنے پر تیار نہ ہو اسے کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے۔ حکم ملتے ہی سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے قید خانے تک لے گئے۔

اندھیری کوٹھری میں بیٹھا ہری سرمان پریشانی کے عالم میں وہاں سے نکلنے کے طریقے سوچتا رہا۔

''کاش کسی طرح ودیا کو میرے یہاں ہونے کی خبر ہو جائے ورنہ میں تو بھوک سے مر ہی جاؤں گا۔''

رات ہوتے ہی جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو اس کی گھبراہٹ بھی بڑھنے لگی۔ پریشانی کے عالم میں وہ بڑبڑانے لگا۔

''کاش میں نے ڈرامہ رچا کر اپنی جھوٹی قابلیت سب پر ظاہر نہ کی ہوتی۔ اسی جھوٹ نے آج مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ ہائے یہ میری زبان! اف یہ زبان! سب اسی کا قصور ہے۔'' وہ کتنی ہی دیر بیٹھا اپنی زبان کو کوستا رہا۔

دوسری طرف معاملہ کچھ یوں تھا کہ درحقیقت زیورات چوری کروانے میں محل کی ایک خادمہ کا ہاتھ تھا جس کا نام جھیوا تھا۔ جھیوا کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ بادشاہ نے چور کی تلاش کے لئے ایک جادوگر کو بلوایا ہے تو وہ سخت پریشانی کا شکار ہو گئی۔

''اب میرا بھید کھل جائے گا۔ اگر میں اس دولت میں سے کچھ حصہ اس جادوگر کو دے کر اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ لوں اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتی ہوں۔''

رات ہوتے ہی اس نے قید خانے کا رخ کیا۔ سپاہی کو اونگھتا پا کر وہ خاموشی سے ہری سرمان کی کوٹھری کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

''زبان! زبان! یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔'' وہ اب تک بڑبڑا رہا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ سنسکرت میں زبان کو جھیوا کہتے ہیں۔ جادوگر کے منہ سے اپنا نام سن کر جھیوا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

''یہ تو ساری حقیقت سے واقف ہے۔'' وہ دنگ تھی۔

اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہونے پر ہری سرمان نے سر اٹھا کر کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عورت کو کھڑا پا کر اسے لگا کہ شاید یہ اس کی بیوی ودیا ہے۔ مارے خوشی کے وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن قریب آنے پر اسے احساس ہوا کہ یہ تو کوئی اور عورت تھی۔ اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ عورت اچانک ہی اس کی منت کرنے لگی۔

''اے عظیم جادوگر! میں مانتی ہوں میں نے ہی وہ زیورات چرانے میں چور کی مدد کی تھی۔ میں آپ کو بتا سکتی ہوں کہ وہ زیورات اس وقت محل کے احاطے میں انار کے درخت تلے دفن ہیں بس مجھ پر ایک احسان کر دیں بادشاہ کے سامنے میرا نام مت لیجیے گا۔''

یہ سنتے ہی ہری سرمان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا لیکن اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے وہ رعب دار آواز میں کہنے لگا۔

''اس دولت میں میرا کتنا حصہ ہوگا؟''

''یہ راز رکھنے کے عوض میں وہ ساری دولت آپ کو دے سکتی ہوں۔ بلکہ سونے کے سکوں کی چند تھیلیاں میں نے اپنے پاس بھی رکھ لی تھیں۔ میں وہ بھی آپ کو دے دوں گی۔'' جھیوا بادشاہ کے عتاب سے بچنے کے لیے یہ بھی کرنے کو تیار تھی۔

''ہاں میں سب جانتا ہوں۔ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اب تم جاؤ اور پہلے وہ تھیلیاں لے آؤ۔ میں تمہارا نام نہیں لوں گا۔''

جھیوا تیزی سے گئی اور اپنے پاس رکھے تمام سکے نکال لائی۔ لیکن واپس آنے پر قید خانے کی حفاظت پر مامور سپاہی نے اسے روک لیا۔ وہ ان دونوں کی ساری باتیں سن چکا تھا۔ اس کی شرط تھی کہ جھیوا اسے بھی ایک تھیلی دے تب ہی وہ اسے جادوگر سے ملنے کی اجازت دے گا۔ چاروناچار جھیوا نے ایک تھیلی اس کے حوالے کر دی۔ ہری سرمان کے پاس پہنچ کر اس نے باقی تھیلیاں اس کے حوالے کر دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ایک تھیلی اسے

رشوت کے طور پر سپاہی کو دینا پڑی۔

''اب میں اسی صورت تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں جب تم اس چور کو پکڑ کر لاؤ جس کی مدد سے تم نے باقی زیورات چرائے تھے۔'' ہری سرمان نے اسے دھمکایا۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ جنگل کے اس پار دوسرے گاؤں میں رہتا ہے۔ وہاں تک جانے کے لیے ایک دن کا سفر کرنا پڑتا ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں وہ کہاں رہتا ہے۔ تم مجھے نہ بھی بتاتی تو پھر بھی مجھے معلوم تھا۔'' ہری سرمان ہوشیاری سے بولا۔

''اب تم جاؤ میں بادشاہ کے سامنے تمہارا نام نہیں لوں گا۔''

اگلے روز سپاہی اسے پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ حسب توقع بادشاہ اس کے ساتھ بہت سختی سے پیش آیا۔

''اگر اب بھی تم نے مجھے چور کے متعلق نہ بتایا تو میں تمہیں بہت کڑی سزا دوں گا۔''

''میں آپ کو اس جگہ لے جا سکتا ہوں جہاں زیورات دفن ہیں لیکن چور کا نام علم رکھنے کے باوجود میں نہیں بتاؤں گا۔''

بادشاہ کو چور سے زیادہ اپنے خزانے کی فکر تھی۔ وہ سپاہیوں کو ساتھ لیے ہری سرمان کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ انار کے درخت کے نیچے کھدائی کرنے پر وہاں سے سارے قیمتی زیورات برآمد ہو گئے۔ بادشاہ اپنی دولت کو واپس پا کر بہت خوش تھا۔ لیکن اس کے دربار کے چند فہم و فراست رکھنے والے وزیروں کو اب بھی ہری سرمان کی صلاحیتوں پر شبہ تھا۔ اپنے شک کی تصدیق کے لیے انہوں نے اس کی حفاظت پر مامور اہلکار کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی۔ اپنا پول کھل جانے کے خوف سے اہلکار نے کچھ نہ بتایا۔ اس کی جھجک دیکھتے ہوئے وزیروں کا شک مزید پختہ ہونے لگا۔

ان ہی وزیروں میں سے ایک وزیر ایسا بھی تھا جس کے مشوروں کو بادشاہ بہت اہمیت دیتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ہری سرمان کی قابلیت جانچنے کے لیے اسے مزید آزمایا جائے۔ بادشاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک برتن میں مینڈک رکھ کر اوپر ڈھکن دے دیا گیا۔ پھر بادشاہ اور تمام وزیروں کی موجودگی میں ہری سرمان کو دربار میں لایا گیا۔

''اگر تم یہ بتا دو کہ اس برتن میں کیا ہے تو بادشاہ سلامت تمہیں بہت نوازیں گے۔'' عقلمند وزیر اس سے مخاطب ہوا۔ یہ سنتے ہی ہری سرمان حواس باختہ ہو گیا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ برتن میں کیا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ گھبراہٹ میں وہ بڑبڑانے لگتا۔ اب بھی وہ یہ ہی کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ گھبراہٹ میں اس طرح بڑبڑانے لگتا تو اس کا باپ اسے غصے سے مینڈک کہہ کر پکارتا تھا۔

''اوہ مینڈک! اس بار تم نہیں بچ پاؤ گے۔'' پریشانی کے عالم میں وہ خود سے کہنے لگا۔ ''مینڈک! مینڈک! اب تمہاری خیر نہیں۔''

یہ سنتے ہی سارے وزیر حیرت زدہ رہ گئے۔ بادشاہ اس کی قابلیت کی تصدیق پانے پر بے حد خوش ہوا۔ اس نے ہری سرمان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی اس پر شک نہیں کرے گا۔ انعام کے طور پر اس نے فوراً ہی شہر میں ہری سرمان کو ایک بڑا گھر اور بہت سی دولت دینے کا اعلان کیا۔ ہری سرمان سکتے کے عالم میں سب سنتا رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کی قسمت ایک بار پھر اس پر مہربان تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ راتوں رات یہاں سے غائب ہو جائے گا کیونکہ قسمت شاید دوبارہ اس کا ساتھ نہ دے۔ اس دن کے بعد کسی نے ہری سرمان کو دوبارہ نہیں دیکھا۔ ☆

بقیہ: ذرا سا پانی

شاید! اس کے پاس پانی ہو۔ حور نے سوچا۔ وہ اونٹ اس کے قریب آ کر رک گیا اور اس پر سے وہ آدمی نیچے اتر آیا۔ ''کیا آپ کے پاس پانی ہے؟'' حور کے منہ سے بمشکل آواز نکلی کیونکہ پیاس کی وجہ سے گلا سوکھ گیا تھا۔

''ہاں ہے۔'' یہ سن کر حور کے چہرے پر زندگی نظر آنے لگی۔ ''مہربانی فرما کر مجھے پانی دے دیں۔ ورنہ میں پیاس سے مر جاؤں گی۔'' حور نے روتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ! میں تمہیں پانی دوں لیکن کیوں؟ تم تو وہی ہو نا جو کہتی تھی کہ

''ذرا سا پانی'' ضائع ہونے سے کیا ہو جائے گا۔ اب پتا چلا ''ذرا سے پانی'' کی اہمیت کا۔ اگر تم ساری دنیا کی دولت بھی مجھے دے دو تب بھی میں تمہیں پانی نہیں دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔ حور ریت پر گر گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

''یا اللہ پلیز مجھے ایک موقع اور دے دیں۔ میں ہمیشہ پانی کو ضائع کرتی رہی، کبھی پانی کی قدر نہیں کی۔'' یا اللہ تعالیٰ پلیز مجھے ایک موقع اور دے دیں میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی پانی ضائع نہیں کروں گی۔ ہمیشہ تیری نعمت کی قدر کروں گی۔'' حور زور زور سے رونے لگی۔

.....☆.....

''حور بیٹا! اٹھو حور بیٹا!'' امی کی آواز سن کر حور نیند سے بیدار ہو گئی۔ اوہ! تو یہ سب خواب تھا، حور بولی۔ ''کیسا خواب بیٹا اور تم نیند میں زور زور سے رو کیوں رہی تھیں؟'' حور نے امی کو اپنا خواب سنایا تو امی بولیں۔

''دیکھا بیٹا میں تم سے کہتی تھی نا کہ پانی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اب تمہیں پتا چلا پانی کی اہمیت کا۔''

''جی امی۔'' حور نے سر ہلایا۔ اس دن کے بعد سے حور پانی کی قدر کرنے لگی اور جب کسی کو پانی ضائع کرتے دیکھتی تو اسے بھی سمجھاتی کیوں کہ اب اسے ''ذرا سے پانی'' کی اہمیت سمجھ آ چکی تھی۔ ☆

ماخوذ

سنہری مچھلی

حسن عمر

کسی ملک میں ایک مچھیرا اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے، دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ مچھیرا صبح تڑکے اپنا جال لئے دریا کے کنارے جا کر مچھلیاں پکڑنا شروع ہو جاتا اور ان مچھلیوں کو بیچ کر اپنے دن کا خرچہ پورا کرتا۔ دونوں کی زندگی بہت مشکل سے گزر رہی تھی لیکن مچھیرا پھر بھی ہر حال میں شکر ادا کرتا رہتا تھا اور اس کے لبوں پر کوئی شکوہ نہیں آتا لیکن اس کی بیوی ہر وقت اس کو طنزیہ باتیں سناتی رہتی تھی۔

''تم کسی کام کے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ تو میری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ تم مجھے کبھی سکون سے نہیں رہنے دے سکتے۔''

مچھیرے کی بیوی ہر وقت ایک ہی بات کرتی رہتی۔ مچھیرے کو اکثر اس کی باتیں سن کر بے حد غصہ آتا لیکن وہ اپنے غصہ پر قابو پاتا اور کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتا۔ اس کی بیوی ہر وقت اس کو طعنے دیتی رہتی کہ وہ کچھ کام نہیں کر سکتا ہے، مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

برسات کے دن تھے اور ان دنوں مچھیرے کو مچھلی پکڑنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، لیکن پھر بھی اس کی بیوی اس کو ہر صبح دریا کنارے بھیج دیا کرتی:

''جاؤ جا کر مچھلیاں شکار کر کے لاؤ، اگر تم خالی ہاتھ گھر آئے تو آج رات تم بھوکے رہو گے۔''

مچھیرا اس کی باتیں سن کر بے حد پریشان ہوا اور اس نے کہا:

''نیک بخت! تم دیکھ تو رہی ہو کہ آج موسم کتنا خطرناک ہو رہا ہے، دریا میں پانی بہت چڑھا ہوا ہوگا، اگر میں وہاں چلا گیا تو پھر ڈوب جانے کا بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

اس کی بیوی نے جب یہ بات سنی تو وہ نہایت طیش سے چلائی:

''فضول بہانے بنانا چھوڑو۔ کچھ نہیں ہوا ہے موسم کو اور کچھ نہیں ہوگا تمہیں لیکن یاد رکھو اگر تم خالی ہاتھ واپس آئے تو پھر بھوکے رہو گے۔''

مچھیرا چار و ناچار اپنا جال اٹھائے دریا کے کنارے پہنچ گیا اور کافی دیر تک اپنا جال دریا میں ڈال کر بیٹھا رہا، کافی دیر اس نے کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور اس کا جال تقریباً خالی تھا، وہ بے حد پریشان ہوا۔

''اگر میں خالی ہاتھ گھر گیا تو آج رات مجھے بھوکا سونا پڑے گا۔ میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

اس نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے جال ایک بار پھر سے دریا میں پھینکا اور اس کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے جال میں کچھ پھنس گیا ہے، وہ بے حد خوش ہوا اور اس نے جلدی سے جال اوپر کھینچا تو اس کے اندر ایک چھوٹی سی سنہری مچھلی تھی جو مچھیرے کے انگوٹھے کے برابر تھی۔ مچھیرا اس مچھلی کو دیکھ کر کچھ مایوس سا ہوا۔

''اگر میں اسے گھر لے گیا تو میری بیوی مجھے مزید ڈانٹے گی کہ اتنی چھوٹی مچھلی لانے کی کیا ضرورت تھی اس کو میں یہیں پر چھوڑ دیتا ہوں۔''

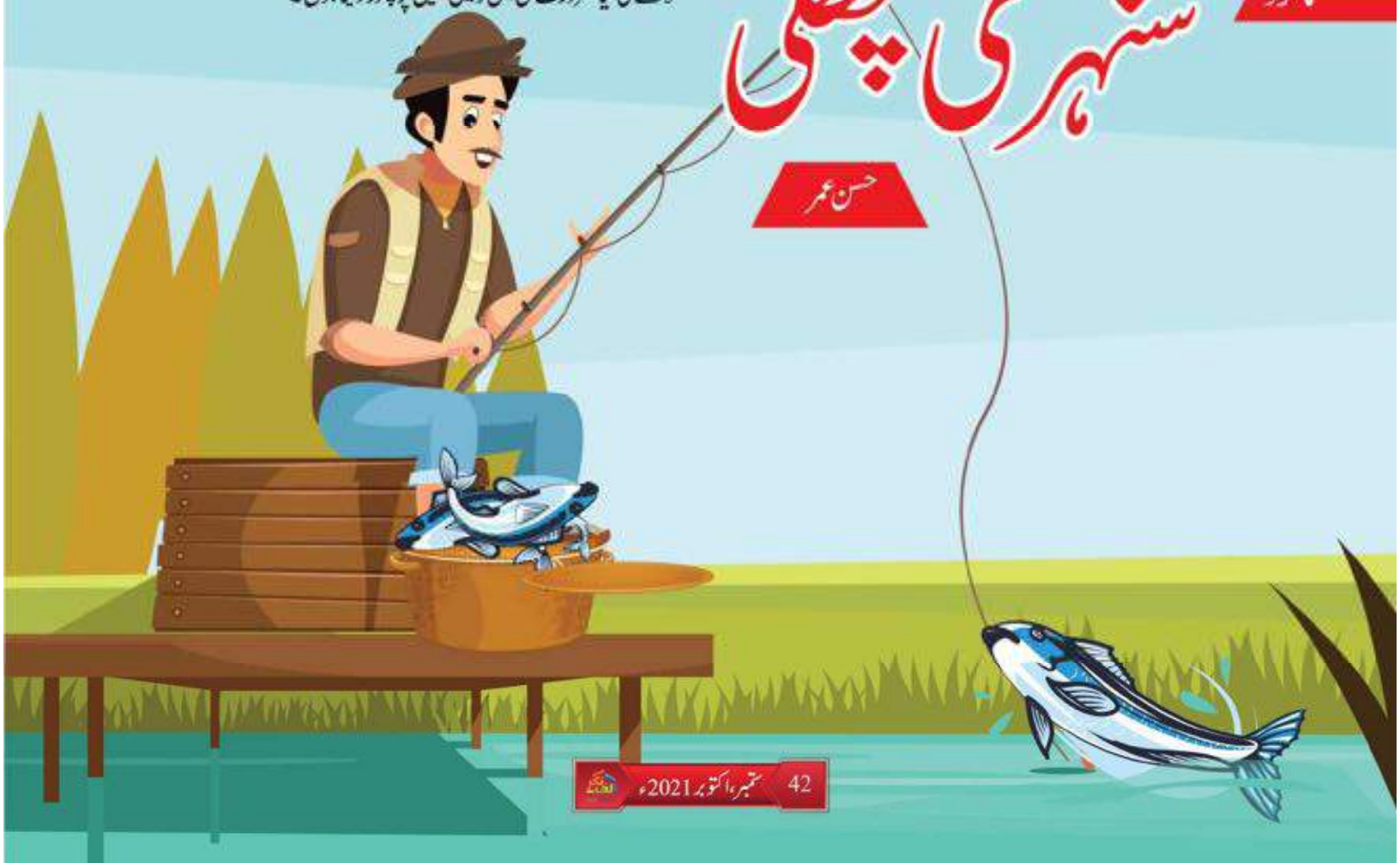

یہ کہتے ہوئے وہ مچھلی کو دوبارہ دریا میں پھینکنے لگا جب مچھلی اچانک انسانی آواز میں اس سے مخاطب ہوئی:

''اے نیک دل انسان! تم نے میری جان بخش دی میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

مچھیرے نے جب اس ننھی سی مچھلی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو وہ ہکا بکا رہ گیا، اس کو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ مچھلی اس سے بات کر رہی ہے۔ اس نے تھوڑا جھجک کر اور ہکلاتے ہوئے مچھلی سے کہا:

''ت۔ تم بات کیسے کر رہی ہو؟''

مچھلی نے اس کی بات سنی تو مسکراتے ہوئے کہا:

''میں دریا میں مچھلیوں کی شہزادی ہوں۔ مجھے انسانوں کی بولی نا صرف سمجھ میں آتی ہے بلکہ میں بہت آرام سے بول بھی سکتی ہوں۔''

مچھیرا اس کی یہ بات سن کر بے حد حیران ہوا۔ اس نے اچانک آسمان کی طرف دیکھا تو اندھیرا چھانا شروع ہو گیا تھا، وہ تھوڑا افسردہ ہوا کیونکہ وہ خالی ہاتھ گھر جا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آج رات بھوکا سوئے گا۔ مچھلی نے جب اس کو پریشان دیکھا تو اس نے اس آدمی سے اس کی پریشانی کی وجہ جانی، آدمی نے اس کو بتایا کہ کس طرح اس کی بیوی نے اس سے کہا ہے کہ اگر وہ خالی ہاتھ گھر آیا تو وہ آج رات بھوکا سوئے گا۔ مچھلی کو یہ سن کر بے حد افسوس ہوا اور اس نے کہا:

''تم نے میری جان بچائی ہے، تم مجھے بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے، میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔''

مچھیرے نے اس کی بات سن کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے کہا:

''شکریہ ننھی مچھلی! لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

مچھلی نے اس کی بات سن کر کہا:

''لیکن اگر تمہیں کبھی کوئی چیز درکار ہو تو تم بس دریا کے کنارے آ کر مجھے آواز دینا۔ مچھلی مچھلی او سنہری مچھلی!

جلدی سے آؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے میں فوراً دریا کے کنارے آ جاؤں گی اور تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہوئی وہ میں تمہیں دے دوں گی۔''

مچھیرے نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اپنے گھر کی راہ لی۔ وہ جب اپنے گھر کے قریب پہنچا تو گھر کے باہر اس کی بیوی اس کا بے چینی اور شدید غصہ میں انتظار کر رہی تھی۔ بیوی نے اُسے دیکھتے ہی کہا:

''تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟ مچھلیاں پکڑنے میں کون اتنی دیر لگاتا ہے۔ جلدی سے مچھلی مجھے دو۔''

مچھیرے نے بیوی کی بات سنی تو اس سے کہا:

''میں صبح سے شام تک دریا کے کنارے بیٹھا رہا، لیکن میرے جال میں کوئی مچھلی نہیں آئی۔''

مچھیرے کی بیوی نے یہ سنا تو وہ زور سے چیخی:

''جھوٹ سفید جھوٹ! ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ تم اتنی دیر بیٹھے رہو اور کوئی شکار نہ ملے۔ تم دریا کے کنارے گئے ہی نہیں ہو کہیں آوارہ گردی کرنے نکل گئے ہو گے۔''

مچھیرے نے اس کی بات سنی تو کافی پریشان ہوا اور پھر مچھیرے نے بیوی کو وہ سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح اس کے جال میں ایک چھوٹی سی سنہری مچھلی پھنس گئی تھی اور کس طرح اس مچھلی نے اس سے کہا کہ اسے اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بس دریا کے کنارے آ کر اس کو آواز دے دے، وہ اس کی ضرورت پورا کر دے گی۔

مچھیرے کی بیوی نے یہ سنا تو اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی:

''تم سے زیادہ بیوقوف انسان میں نے اس دنیا میں نہیں دیکھا تم نے اس سے کچھ مانگا کیوں نہیں؟ جاؤ جا کر اس سے کہو کہ ہمارے لئے شاندار کھانے کا انتظام کرے۔''

مچھیرا اس کی بات سن کر خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر دریا کے کنارے گیا اور وہاں جا کر اس نے آواز لگائی:

''مچھلی مچھلی او سنہری مچھلی! جلدی سے آؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

تھوڑی دیر میں ہی وہ ننھی سنہری مچھلی دریا کے کنارے آ گئی، اس نے مچھیرے کو دیکھا تو اس سے پوچھا: ''کیا ہوا مچھیرے بھائی؟ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟''

مچھیرے نے اس کو بتایا کہ وہ اپنے اور اپنی بیوی کے لئے رات میں شاندار کھانا چاہتا ہے، مچھلی نے اس کی بات سنی تو تھوڑی دیر خاموش رہی اس کے بعد اس نے کہا:

''تم گھر چلے جاؤ، تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔''

مچھیرا ایک بار پھر خالی ہاتھ گھر واپسی کے لئے نکل پڑا راستے میں اس کا دل ڈوب رہا تھا کہ اُس کی بیوی اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر نجانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ لیکن جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی بیوی گھر کا دروازہ کھولے اس کا انتظار کر رہی ہے اور میز پر بہت سی کھانے پینے کی چیزیں سجی ہوئی ہیں۔ مچھیرا یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا، دونوں نے اس رات پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دوسری صبح جب مچھیرا شکار کے لئے جانے لگا اور اپنا جال اٹھانے لگا تو اس کی بیوی نے اس سے پوچھا:

''تم کدھر جا رہے ہو؟''

مچھیرا اس کی بات سن کر حیران ہوا اور کہا:

''کہاں جا رہا ہوں مطلب؟ شکار کے لئے ہی جا رہا ہوں، آج کے کھانے کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔''

بیوی نے اس کی بات سنی تو بے حد غصہ ہوئی:

''تم رہنا سدا کے بیوقوف! جب تمہارے پاس سنہری مچھلی ہے تو تمہیں شکار کی کیا ضرورت؟ تم جاؤ اور جا کر سنہری مچھلی سے کہو کہ اب ہمیں ایک شاندار گھر کی ضرورت ہے اور ڈھیر سارا روپیہ پیسہ چاہیے، تاکہ تمہیں کوئی کام نہ کرنا پڑے۔''

مچھیرا اس کی بات سن کر حیران ہوا لیکن وہ کچھ بھی کہے بغیر ایک بار پھر دریا کے کنارے آ گیا اور اس نے مچھلی کو آواز دی:

''مچھلی مچھلی او سنہری مچھلی! جلدی سے آؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

تھوڑی دیر میں مچھلی دریا کے کنارے آ گئی، اور اس نے مچھیرے سے کہا:

''کہو مچھیرے بھائی! تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟''

مچھیرے نے کہا:

''میں چاہتا ہوں کہ میرا ایک نہایت شاندار گھر ہو اور مجھے روپے پیسے کی کوئی کمی نہ ہو۔''

مچھلی نے اس کی بات سنی تو تھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر اس نے کہا:

''تم گھر جاؤ، تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔''

مچھیرا گھر واپس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے پرانے گھر کی جگہ ایک نہایت شاندار سی حویلی موجود ہے اور وہاں ڈھیر سارے نوکر چاکر بھی موجود ہیں۔ وہ گھر کے اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی بالکل کسی ملکہ کی طرح بیٹھی ہے۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن اس کی بیوی اس کو دیکھ کر ایک بار پھر غصہ کرنے لگی۔

''تم رہنا ہمیشہ سدا کے بیوقوف! اتنا اچھا گھر اور اتنا سارا روپیہ پیسہ تم نے لے لیا ہے لیکن یہ بھول گئے کہ ہم دونوں کتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ تم جا کر مچھلی سے کہو کہ وہ تمہیں بھی ایک بار پھر سے جوان کر دے اور مجھے تم سے بھی زیادہ کم عمر کر دے۔''

مچھیرا اس کی یہ بات سن کر خاموشی سے ایک بار پھر دریا کی طرف گیا اور اس نے مچھلی کو آواز دی: ''مچھلی مچھلی او سنہری مچھلی! جلدی سے آؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

تھوڑی دیر میں مچھلی ایک بار پھر سے دریا کے کنارے آ گئی اور اس نے کہا:

''کہو مچھیرے بھائی؟ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟''

مچھیرے نے کچھ اداسی سے کہا:

''سنہری مچھلی، میری بیوی چاہتی ہے کہ میں ایک بار پھر سے جوان ہو جاؤں اور وہ مجھ سے بھی زیادہ کم عمر ہو جائے۔''

سنہری مچھلی اس کی بات سن کر خاموش رہی اور پھر اس نے کہا:

''ٹھیک ہے مچھیرے بھائی! لیکن یہ یاد رکھنا کہ اب جو بھی ہوگا، اس کو میں دوبارہ پلٹ نہیں سکتی اور اب میں تمہاری مزید مدد نہیں کر سکوں گا۔ تم گھر جاؤ، تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔''

مچھیرا اس کی بات سننے کے بعد بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹ گیا، وہ اپنے گھر پہنچا تو دیکھا وہاں سب ملازمین، موجود ہیں لیکن اس کی بیوی کا کہیں نام و نشان نہیں، ایک کمرے سے گزرتے ہوئے اُس کی نظر ایک آئینے پر پڑی۔ وہ حیران رہ جاتا ہے۔ آئینے میں اُسے ایک خوش شکل نوجوان نظر آتا ہے وہ اپنے آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور اپنی بیوی کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اچانک اس کو ایک کمرے سے کسی چھوٹی سی بچی کی رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ کمرے میں جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک ڈیڑھ سال کی بچی زمین پر بیٹھی رو رہی ہے۔ مچھیرا اس بچی کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے پھر وہ اس کا لباس دیکھتا ہے تو لباس اُس کی بیوی کا ہوتا ہے۔ مچھیرا سمجھ جاتا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہی ہے جو اپنی بیوقوفانہ خواہشات کی وجہ سے اس انجام تک پہنچی ہے۔ مچھیرا اُسے دیکھ کر بے حد افسردہ لہجہ میں کہتا ہے:

''میں تمہیں ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ اتنا لالچ مت کرو۔ افسوس! تم نے میری بات نہ سنی اور افسوس! اب میں تمہاری مزید کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا۔''

پیارے بچو! ہمیں ہمیشہ قناعت اور صبر سے کام لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں جتنا نوازا ہے اس پر شکر کرنا چاہیے اور زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہیے۔

(ماخوذ: روسی لوک ادب)

سرمکھی چوس

بہت پہلے اپنے والد کو بتا دینی چاہیے تھی۔ نہیں بتایا تو۔۔۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جیسے میری وجہ سے سر کی سارے سکول کے سامنے کئی بار تذلیل کی گئی۔ اسی طرح ان کی بے گناہی کی گواہی بھی سب لوگوں کے سامنے دی جانی چاہیے۔''

حیدر کی، احتشام صاحب کی پرنسپل صاحب کی سر توقیر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھی۔ مجمع میں اکثر لوگوں کی آنکھیں نم تھی۔

''سر میں آپ کا احسان تو کبھی نہیں اتار سکتا مگر آج سب کے سامنے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ استاد بادشاہ نہیں ہوتا مگر بادشاہ بنا دیتا ہے۔''

حیدر نے سامنے بیٹھے سینکڑوں لوگوں کو جیسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ یہ سکتہ جب ٹوٹا تو لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کے آڈیٹوریم کی چھت سر پہ اٹھائی تقریب کے اختتام پر حیدر نے گردن موڑ کر دیکھا سر توقیر اور احتشام صاحب آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سر توقیر نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا، احتشام صاحب نے ان کا ہاتھ ایسے تھاما جیسے عقیدت سے کسی مقدس چیز کو سنبھالتے ہیں۔ حیدر کو اتنی دور سے بھی احتشام صاحب کی جھکی نظر اور نم آنکھیں نظر آ رہی تھی۔ سر توقیر نے بازو احتشام صاحب کے شانوں پر پھیلا دیئے اور حیدر کی طرف بڑھ گئے۔ ☆

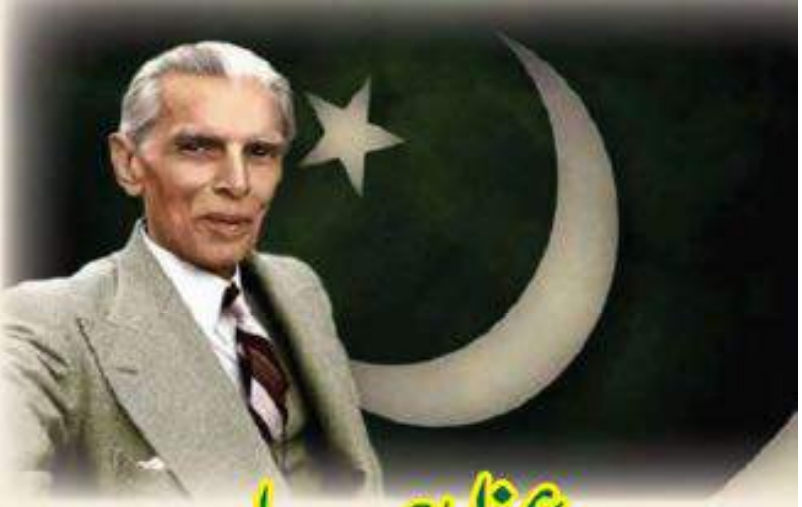

قائداعظمؒ محمد علی جناح

محمد خالد خان

پیارے بچو! قائداعظم کو دنیا بہت سے خوب صورت حوالوں سے جانتی ہے مگر پاکستانیوں کے لیے یہ نام ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ نام ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک تحریک کا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ ذہن میں قائد اور پاکستان کا نام ساتھ ساتھ آتا ہے۔ وہ پاکستان جسے انہوں نے محنت، ہمت اور لگن سے مسلمانوں اور اسلام کے نام پر بنایا۔

25 دسمبر 1876ء کو اتوار کے روز کراچی میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے ''محمد علی جناح'' نام رکھا۔ جن کو آج ہم سب ''قائداعظم'' کے نام سے جانتے ہیں۔ محمد علی جناح جس گھر میں پیدا ہوئے اسے آج ''وزیر مینشن'' کہتے ہیں۔

محمد علی جناح کے والد کا نام جناح پونجا تھا اور ان کا پیشہ تجارت تھا۔ محمد علی جناح بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ گھر والے پیار سے آپ کو محمد بلاتے تھے۔ آپ کی چار بہنیں رحمت، مریم، فاطمہ، شیریں اور بھائیوں میں تین چھوٹے بھائی احمد علی، بندے علی اور بُچو شامل تھے۔ 1887ء سے 1892ء تک محمد علی جناح نے پرائمری تعلیم ''سندھ مدرستہ الاسلام'' سے حاصل کی۔ رات گئے تک پڑھنا ان کا معمول تھا۔ آپ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ قائداعظم فارغ اوقات گھڑ سواری، کرکٹ اور پتنگ بازی پسند کرتے تھے۔ محمد علی جناح پنجم کلاس میں ہی تھے کہ جب آپ کے والد نے اپنے دوست کے مشورے سے آپ کو تعلیم کے لیے لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ 1892 میں سولہ سالہ محمد علی جناح قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن روانہ ہوگئے۔

قائداعظم کو سیاسی لیڈروں کی تقاریر سننے اور باقاعدگی سے اخبار پڑھنے سے سیاست میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ لندن کی ان مصروفیات نے ان کے دل میں آزادی کے لیے تڑپ پیدا کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے وکالت کی تعلیم مکمل کی۔ اتنی کم عمری میں وکالت کی تعلیم مکمل کرنے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ پھر قائداعظم نے بمبئی میں وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ شروع کے چند سالوں میں انہیں کافی مشکلات پیش آئیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی دیانت داری، بے باکی اور حق گوئی کی وجہ سے مشہور ہوگئے۔

محمد علی جناح 6 ستمبر 1913ء کو مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ آزادی کے حصول کیلئے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی۔ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے 1916ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ''معاہدہ لکھنؤ'' ہوا۔ اس معاہدے کی اہم بات یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے حق کو مان گئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس اب مسلمانوں کو ہندوؤں سے ایک الگ قوم سمجھتی ہے اور مسلمانوں کو بھی ان کے جائز حقوق ملیں گے۔ محمد علی جناح کو ان کی کوششوں پر انہیں ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' کا خطاب دیا گیا۔

18 اپریل 1918ء کو آپ نے رتی بائی سے شادی کرلی۔ 18 اگست 1919ء کو ان کے گھر اکلوتی بیٹی دینا پیدا ہوئی۔

قائداعظم ایک بااصول سیاسی رہنما تھے، آپ یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ آزادی کے لیے جدوجہد بھوک ہڑتالوں، قانون شکنی یا تشدد کے ذریعے کی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی بات منوالی جائے۔

1937ء کے انتخابات آئے تو قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کو مسلمانوں میں مقبول کرنے کے لیے پورے ہندوستان کے دورے کرنے شروع کردیئے تاکہ ان میں ایک الگ قوم کا احساس پیدا کیا جاسکے مگر مسلمان اس وقت منظم نہ تھے اسی لئے انتخابات میں کانگرس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کانگرسی وزارتوں نے طاقت کے غرور میں مسلمانوں پر ظلم کرنے شروع کردیئے۔ ان کے مکانات کو آگ لگادی جاتی۔ ملازمتوں میں حصہ نہ دیا جاتا۔ سکولوں میں تمام بچوں کے لیے گاندھی جی کی مورتی اور تصویر کو ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا، ہندوؤں کا مذہبی گیت بندے ماترم گانا اور کانگرسی جھنڈے کو سلام کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔

جب مسلم لیگ نے کانگرسی وزارتوں کے مسلمانوں پر ظلم وستم کی تحقیقات کروائی تو گاندھی جی اور نہرو کوئی جواب نہ دے سکے۔ اڑھائی سالہ دور حکومت کے بعد جب کانگرسی حکومت نے استعفیٰ دیا تو سب مسلمانوں نے محمد علی جناح کی ہدایت پر 22 اگست 1939ء کو کانگرسی وزارتوں سے چھٹکارے پر ''یوم نجات'' منایا۔ سارے مسلمان کانگرس سے الگ ہوگئے اور مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ آپ کی کوششیں رنگ لائیں اور مسلم لیگ آپ کی سربراہی میں ترقی کرتی چلی گئی۔

مسلمان قوم نے اپنے لیڈر کی بے باکی، دیانتداری اور ذہانت پر ان کو قائداعظم کا خطاب دیا اور قائداعظم کا لفظ 1938ء میں مولانا مظہر الدین نے اپنے اخبار میں استعمال کیا۔ پھر کانگرس نے اپنے کارکنوں کے ذریعے مار دھاڑ اور فسادات شروع کردیئے تاکہ مسلمانوں کی مطالبہ پاکستان سے توجہ ہٹادی جائے۔ قائداعظم اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہوئے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اب مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے

بقیہ صفحہ نمبر: 70

اُلٹے میاں نے حلّوا پکایا

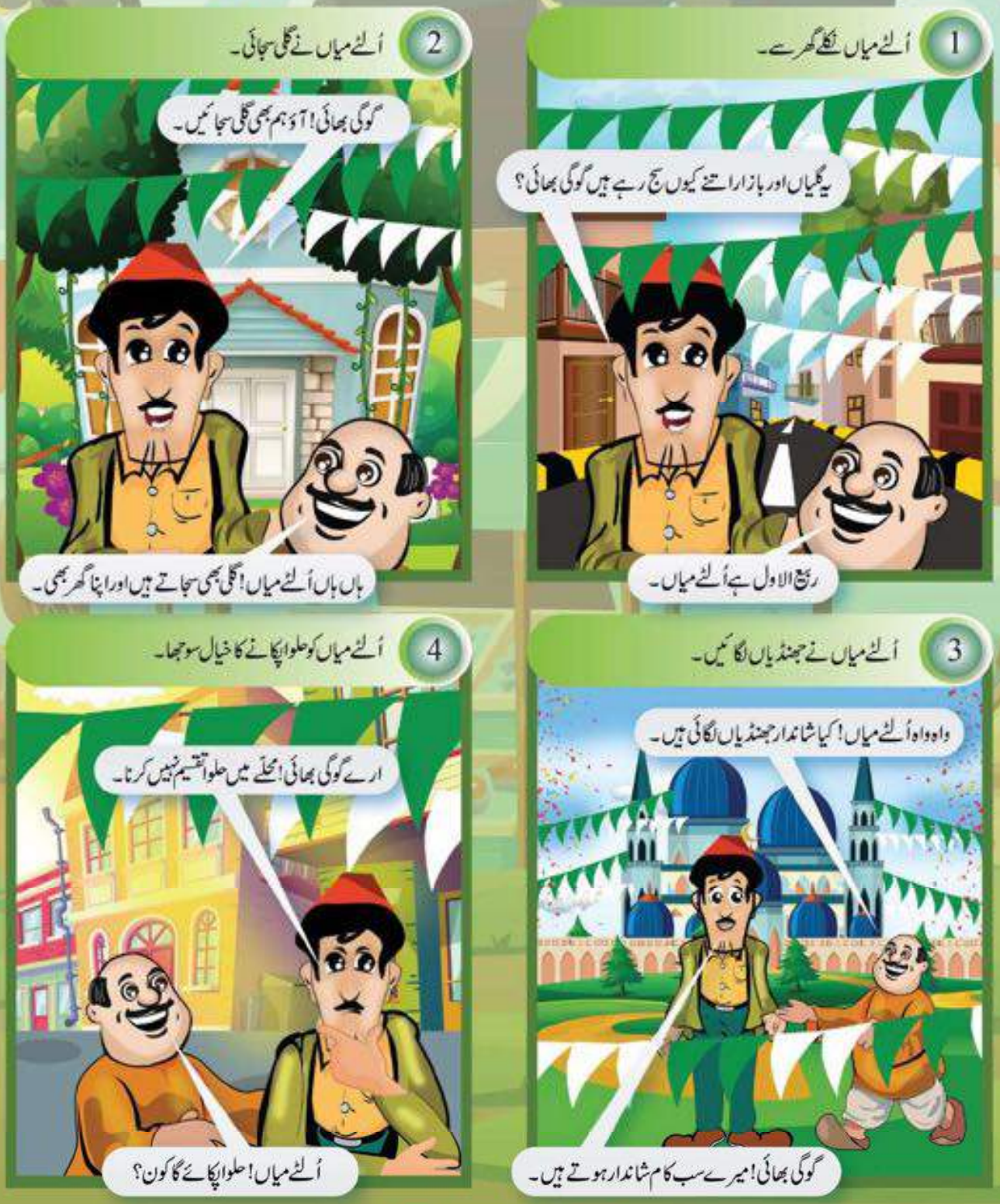

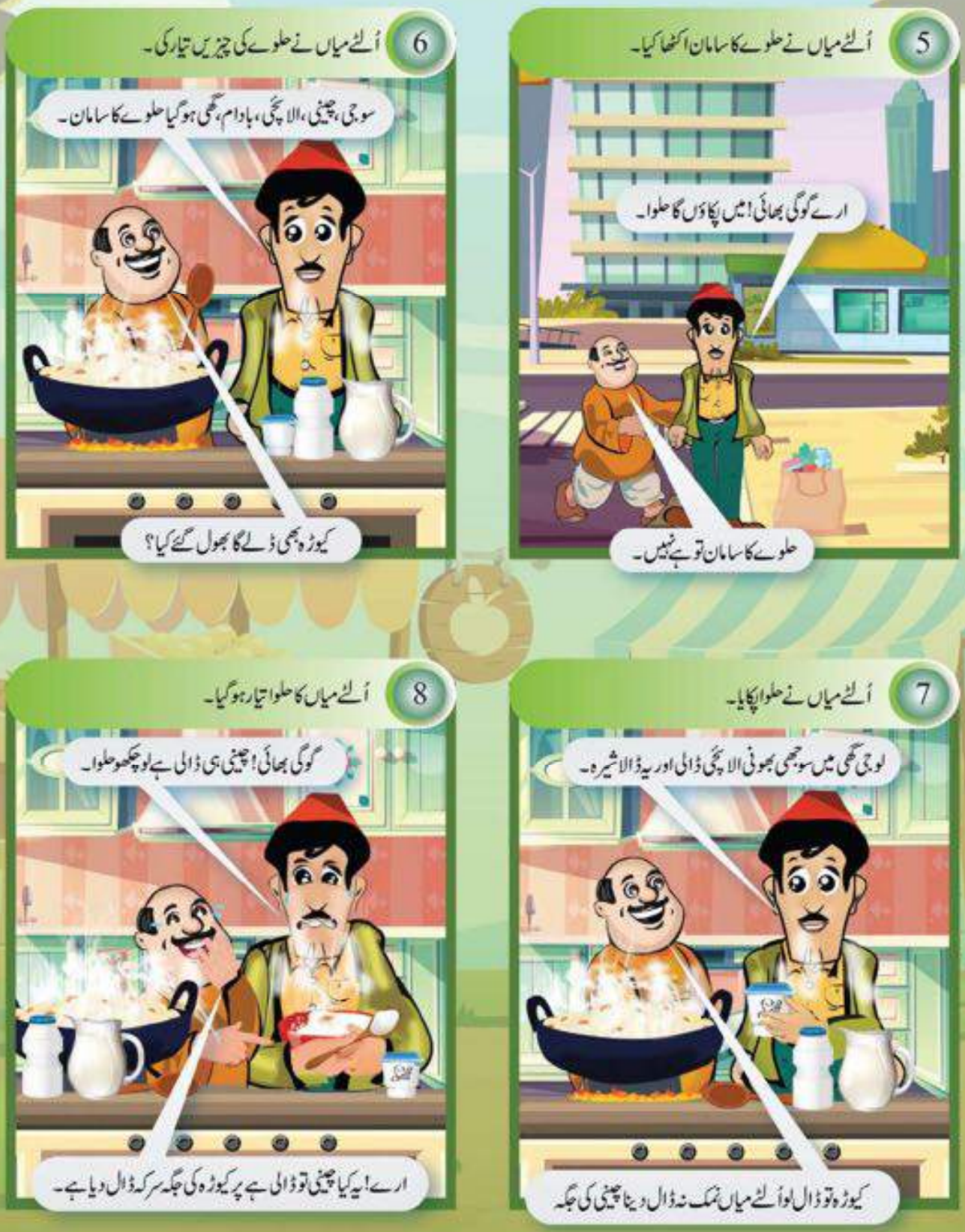
5 اُلٹے میاں نے حلوے کا سامان اکٹھا کیا۔
ارے گوگی بھائی! میں پکاؤں گا حلوا۔
حلوے کا سامان تو ہے نہیں۔
6 اُلٹے میاں نے حلوے کی چیزیں تیار کی۔
سوجی، چینی، الائچی، بادام، گھی ہو گیا حلوے کا سامان۔
کیوڑہ بھی ڈالے گا بھول گئے کیا؟
7 اُلٹے میاں نے حلوا پکایا۔
لو جی گھی میں سوجھی بھونی الائچی ڈالی اور یہ ڈالا شیرہ۔
کیوڑہ تو ڈال لو اُلٹے میاں نمک نہ ڈال دینا چینی کی جگہ
8 اُلٹے میاں کا حلوا تیار ہو گیا۔
گوگی بھائی! چینی ہی ڈالی ہے لو چکھو حلوا۔
ارے! یہ کیا چینی تو ڈالی ہے پر کیوڑہ کی جگہ سرکہ ڈال دیا ہے۔

سچا جھوٹ!

اختر سردار چودھری

جنید نے بڑی مشکل سے روٹی کا نوالہ حلق سے نیچے اتارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں کی تیاری پکڑلی ہے شہزادے نے؟'' اس کی والدہ نے پوچھا۔

''جی میں وہ باہر کھیلنے جا رہا ہوں۔'' جنید نے بے رخی سے جواب دیا۔

''ابھی نہیں دو گھنٹے بعد جانا ہے، باہر بہت گرمی ہے۔'' اس کی امی نے حکم جاری کر دیا۔ جنید کو غصہ تو بہت آیا، لیکن بولا کچھ نہیں صرف اپنی والدہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

''گرمی میں باہر نہیں جانا، سکون سے بیٹھو اور انتظار کرو۔ تھوڑا سورج ڈھل جائے تو چلے جانا۔'' اس کی ماما نے اس کا چہرہ دیکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جنید ناگواری سے بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ ''سب مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔'' پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

''پاپا سچ ہی کہتے ہیں۔'' اس کی امی نے سن لیا۔

''پاپا کیا سچ کہتے ہیں؟'' جنید کی والدہ جن کا نام سلمیٰ بی بی تھا نے پوچھا۔

''میں کیوں بتاؤں۔''

جنید نے جواب دیا۔

''زیادہ تیز نہ بنو سچ سچ بتاؤ کیا کہہ رہے ہو؟'' جنید کی ماما سلمیٰ نے باقاعدہ چپل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ جنید کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اس چپل سے اچھی طرح واقف تھا۔ اب جھوٹ بول نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی ماما نے اس کا یہ فقرہ سن لیا تھا۔ اب اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔

''پاپا کہتے ہیں تمہاری ماما کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔'' جنید نے چپل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ماما نے چپل رکھ دی اور اُن کے ماتھے پر بل آ گئے۔ آنے دو آج آپ کے پاپا کو۔ پوچھتی ہوں بیٹے کو کیا اوٹ پٹانگ سمجھاتے رہتے ہیں۔'' جنید کے طوطے اڑ گئے۔ بات پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئی تھی، پہلے تو دو چار چپل سے کام چل جاتا تھا اب پاپا۔ اسے پاپا کی ڈانٹ یاد آئی تو جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''ماما ماما بات سنیں۔ وہ نا، وہ نا، دیکھیں میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ اتنی گرمی مجھے کیا کہتی ہے اور پاپا کہتے ہیں مرد کو مضبوط ہونا چاہیے۔'' اس نے پوری کوشش کی بات بدل جائے لیکن وہ بھی اس کی ماں تھیں۔

''نہیں بیٹے تم نے کہا ہے پاپا کہتے ہیں تمہاری ماما کو سمجھانا مشکل ہے۔ یعنی میں ناسمجھ ہوں۔'' جنید کے لیے اب دونوں میں سے ایک طرف سے پٹائی ہوتی پکی نظر آ رہی تھی۔

''ماما وہ تو پاپا آپ کو کہہ رہے تھے میں نے سن لیا تھا وہ اس دن جس دن۔'' جنید

نے بات بنانے کے لیے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بیٹے یہ بات تو اب شام کو ہوگی۔ تمہیں اب باہر جانے کی اجازت نہیں ہے آج کھیلنے سے چھٹی سمجھو۔'' یہ کہہ کر اس کی ماما وہاں سے چلی گئی۔ جنید کے لیے بڑا مشکل وقت آ گیا تھا۔ ماما کی مار کھانا آسان تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہ کھا چکا تھا، لیکن پاپا کی ڈانٹ یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے پاپا بلاوجہ نہیں ڈانٹتے تھے نہ ہی سزا دیتے تھے۔ اپنی اولاد کو دوست بنا کر رکھتے تھے لیکن انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ ایک بار جنید کی جھوٹ کی وجہ سے اچھی خاصی پٹائی ہوئی تھی۔ اسی طرح اس کے والد چودھری فلک شیر کو چوری سے نفرت تھی۔ پچھلے سال جنید نے پڑوسیوں کا ایک پلا چوری کر کے چھت پر اس کا ڈربہ بنا کر رکھ لیا تھا۔ ایک تو اس نے چوری کی دوسرا جھوٹ بولا کہ حماد نے دیا ہے۔ جب اس کے والد کو ان سب باتوں کا علم ہوا تو اس کی اچھی خاصی پٹائی ہوئی تھی۔ جنید کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس وقت بھی ماما نے اس کی جاسوسی کی تھی اور تمام تحقیقات کو سرانجام دی تھی۔ ماما بظاہر اس کی ہمدرد تھی اس سے پیار بھی بہت کرتی تھی۔ اسی کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اکثر انہیں شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

ماما اسے سب سے زیادہ چاہتی بھی تھی لیکن بعض معاملات میں جنید کو لگتا تھا کہ اس کی دشمن بن جاتی ہیں۔ جھوٹ، چوری والدین یا اساتذہ کی نافرمانی کسی ضعیف یا محلے کے بزرگ کی شان میں گستاخی یا کسی بھیک مانگنے والی کی بے عزتی جیسے جرائم پر اس کی ماما بھی پاپا کی طرف داری کرتی تھی۔ آج تو بہت بڑا جرم ہو گیا تھا۔ اس نے ماما کو پاپا کی ایسی بات بتا دی تھی جو انہوں نے ایک دن جنید سے کہی تھی۔ ہوا ایسا تھا کہ جنید بازار سے گیند بلا خریدنے کی سارا دن ضد کرتا رہا اور اس کی ماما نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''بالکل نہیں تم لوگ گلی میں کھیلتے ہو۔ گیند کسی کے گھر چلی جاتی یا کسی کے گھر کا شیشہ ٹوٹ جاتا جس سے لڑائی ہونے کا زیادہ خطرہ ہوتا جب کہ گلی میں سے گزرنے والے لوگ بھی تنگ ہوتے ہیں۔''

اس کی والدہ کا ایک موقف تھا۔ شام کو پاپا آئے تو مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ جنید کو اس کے پاپا بازار لے کر گئے تھے اور راستے میں کہا تھا۔

''تمہاری ماما کو سمجھانا مشکل ہے۔ بچے گلی میں نہیں کھیلیں گے تو کہاں جا کر کھیلیں گے۔ یہاں کون سا پارک بنا ہوا ہے۔'' آج کافی دنوں بعد اس نے یہ بات ماما کو بتائی تھی۔ اب شام کو پہلے تو ماما پاپا کی آپس میں لڑائی ہوگی اس کے بعد اس کی خیر نہیں۔ یہ سوچ کر اس سے بیٹھا نہ گیا۔ اس نے سوچا پاپا سے بچنے کے لیے کسی کی مدد لی جائے۔ کافی سوچ و بچار کے بعد ایک آئیڈیا اس کے دماغ میں آیا۔ ماما سے پہلے پاپا کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے تو سو فیصد بچت ممکن تھی۔ اس کے لیے ماما سے پہلے پاپا سے ملاقات کرنا بہت ضروری تھا۔

''ماما! میں یہاں دروازے پر ہی کھیل لوں۔'' جنید نے وہاں بیٹھے بیٹھے ماما کو پکارا۔

''نہیں غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ آرام سے اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔'' اس کی ماں نے صاف جواب دیا۔ وہ جانتا تھا اب ماما کو کسی بھی طرح شکایت سے نہیں روکا جا سکتا۔ ابھی اس کے پاپا کے گھر آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے وہ سوچتا رہا۔ اس کے دماغ میں کئی ایک منصوبے آئے جنہیں اس نے خود ہی مسترد کر دیا۔

وہ جانتا تھا جب ماما اور پاپا اس کے خلاف ہو جاتے ہیں تو وکیل و جج بننے کے ساتھ دونوں بظاہر آپس میں لڑتے ہیں اور بچوں سے پیار بھی بہت کرتے ہیں، لیکن جب جنید کی کوئی غلطی ہوتی تو دونوں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم ہو جاتا تھا۔ وقت گزرتا رہا جنید منصوبے بناتا رہا اور خود ہی مسترد کرتا رہا۔ اس نے سوچا اس بات سے صاف مکر جائے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ ماما کو جھوٹا ثابت کیا جائے۔ یہ بات اس کے پاپا کو ہضم نہیں ہو سکتی تھی کہ سلمیٰ اپنی اولاد کے خلاف کوئی جھوٹ بولے۔ آخر باہر موٹر سائیکل کی آواز آئی تو اس کی ماما نے دروازہ کھولا۔ جنید کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

پاپا نے پہلے دوسرے کمرے میں کپڑے تبدیل کیے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ جنید چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے تو منصوبے بناتا رہا تھا، اب مشکل پڑی تو رب یاد آیا۔ کافی دیر وہ اللہ سے دعا کرتا رہا۔ اس کی پیشی نہیں ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ آخر اس کی ماما نے اسے آواز دی۔

''جنید تمہارے پاپا بلا رہے ہیں۔'' جنید نے سنی ان سنی کر دی۔

آخر اس کی ماما اسے بلانے آئیں۔ اس نے ماما کا چہرہ غور سے دیکھا، وہاں سے کچھ بھی پڑھنا مشکل تھا۔ وہ اٹھا منہ ہاتھ دھویا اور ماما کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ صحن میں پنکھا چل رہا تھا۔ ایک چارپائی پر اس کے پاپا بڑے آرام سے بیٹھے تھے۔

''دیکھو بیٹے سچ سچ بتانا۔ آج تمہاری ماما نے تمہاری شکایت کی ہے۔'' اس کے پاپا نے خفگی سے پوچھا۔

''پاپا وہ میں نے مذاق میں۔'' جنید نے پاپا کو دیکھ کر جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''مطلب تم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہو کہ تم نے ایک درست بات کو غلط مفہوم دے کر بیان کیا ہے۔ میرے کہنے کا وہ مقصد نہیں تھا جو تم نے بنا کر ماما سے کہا اور جو انہوں نے سمجھا ہے۔'' جنید اسی طرح مؤدب کھڑا رہا۔ اس کی ماما کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جی پاپا۔'' جنید نے جلدی سے جواب دیا۔

اس کے پاپا نے اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔ اس کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگ گئے۔ اس کے بعد اسے مرغا بنا دیا گیا۔ دونوں میاں بیوی بیٹھے اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس کی بہت بڑی بڑی

بقیہ صفحہ نمبر: 61

پاک فضائیہ کے شاہین

حافظ محمد دانش عارفین حیرت

قیام پاکستان کے وقت جہاں ہر چیز کی تقسیم کی گئی، وہیں پر افواج کی بھی تقسیم بھی ہوگی۔ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ تمام افواج کا 64 فیصد حصہ بھارت جبکہ باقی 36 فیصد حصہ پاکستان کو دیا گیا۔ یوں قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاکستانی فوج کے تمام ادارے (فضائی، بری اور بحری) وجود میں آ گئے۔ ہم یہاں پر آپ کو پاک فضائیہ کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں گے۔

پاک فضائیہ کا تعارف:

اس لیے فضائی سرحد کی حفاظت کے لیے فضائی فوج مختص کی جاتی ہے۔ پاکستان کی فضائی سرحد کی حفاظت کے لیے بھی پاک فضائیہ موجود ہے۔ یہ زمینی افواج کو مدد فراہم کرتی ہے۔ زمینی فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے اور لے جانے کے علاوہ حالت جنگ میں زمینی فوج کو ہتھیار بھی فراہم کرتی ہے۔

پاک فضائیہ کا نام:

پاک فضائیہ کا ابتدائی نام ''شاہی پاک فضائیہ'' تھا۔ یہ نام قیام پاکستان کے فوری بعد ہی فضائی فوج کو دیا گیا تھا۔ 23 مارچ 1956 کو ہوائی فوج کا نام ''شاہی پاک فضائیہ'' سے بدل کر ''پاک فضائیہ'' رکھ دیا گیا۔ یہ نام آج تک رائج ہے۔

پاک فضائیہ کے خدمت گار:

قیام پاکستان کے وقت پاک فضائیہ کے پاس 2332 خدمت گار تھے۔ مگر اب پاک فضائیہ کے پاس اندازاً 65 ہزار سے زائد اہلکار موجود ہیں۔ ان میں سے 3 ہزار پائلٹ ہیں جو 1530 ہوائی جہاز اڑانے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ اہلکار 24 گھنٹے فضائی حدود کی نگرانی کرتے ہیں۔ جس سے کروڑوں پاکستانی آزاد فضاء میں سانس لیتے ہیں۔

پاک فضائیہ کے ہتھیار:

پاک فضائیہ کا سب سے بڑا ہتھیار لڑاکا طیارے (جنگی جہاز) اور ان طیاروں کو اُڑانے والے ہوائی اڈے (ایئر بیس) ہیں۔ پاکستان کے ہوائی اڈوں کی تعداد تقریباً 21 ہے۔

مشہور ہوائی اڈوں کی فہرست یہ ہے: جیکب آباد ایئر بیس، گڑھا سلیم ہوائی اڈا (جہلم)، منہاس ایئر بیس (کامرہ) فیصل ایئر بیس (کراچی)، مسرور ایئر بیس (کراچی)، بھولاری ایئر بیس (کراچی) کوہاٹ ایئر بیس میانوالی ایئر بیس مرید کے ایئر بیس، پشاور ایئر بیس، راہوالی آرمی ایئر فیلڈ (گوجرانوالہ)، رسالپور ایئر بیس، سرگودھا ایئر بیس، رفیقی ایئر بیس (شورکوٹ)، سیالکوٹ کینٹ ہوائی اڈا۔

مشہور لڑاکا طیارے:

یوں تو پاک فضائیہ کے پاس 1530 ہوائی جہاز موجود ہیں۔ مگر ان میں سے گنے چنے ہی لڑاکا طیارے ہیں جو فضائی جنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔ پاکستان کے پاس 76 جے ایف سولہ طیارے ہیں۔ جبکہ جے ایف تھنڈر 17 کی تعداد 100 کے قریب ہے۔ یہی نہیں پاکستان اب چین کے تعاون سے اپنے 150 جے، ایف 17 تھنڈر طیارے بنا رہا ہے۔ ان طیاروں کا پہلا سکواڈرن پاک فضائیہ میں شامل ہو چکا ہے۔ ان طیاروں کے مکمل ہونے کے بعد پاکستان کے پاس جے ایف تھنڈر 17 کی تعداد 250 ہو جائے گی۔ جے ایف 17 طیاروں کے آنے کے بعد ایف 7 طیاروں کو ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ جن کی تعداد تقریباً 185 ہے۔ پاک فضائیہ کے پاس تربیتی مقاصد کے لیے 145 مشاق اور K-8 ماڈل کے 60 طیارے بھی موجود ہیں۔

سامان کی نقل و حمل کے لیے بھی مختلف جہاز موجود ہیں۔ جبکہ آئی ایل۔78 نامی طیارے لڑاکا جہازوں میں دوران پرواز ہی ایندھن بھرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یعنی یہ طیارے فضا میں لڑاکا جہازوں کے لیے پٹرول پمپ کی خدمات سر انجام دیتے ہیں۔

پاک فضائیہ کے مستقبل کے عزائم:

مستقبل میں پاک فضائیہ 5th جنریشن کے لڑاکا طیارے بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس پراجیکٹ کے ابتدائی حصوں پر کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ طیارے بھی پاکستان اپنے دوست چین کی مدد سے بنائے گا۔ دور حاضر میں ڈرون طیاروں کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان جدید ڈرون طیارے بھی بنا رہا ہے جو بغیر پائلٹ کے پرواز کریں گے، دور مار میزائلوں سے لیس ہوں گے اور دیر تک پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ پاک فضائیہ مستقبل میں ڈرون حملوں سے بچاؤ کے لیے ایک خاص ٹیکنالوجی پر کام کر رہی ہے۔ کوئی بھی ڈرون جہاز پاکستان کی سرحد سے 200 میٹر کے فاصلے پر ہی فضا میں تباہ ہو جائے گا۔ اس ٹیکنالوجی سے پاکستان ہر قسم کے فضائی حملوں سے محفوظ رہے گا۔

پاک فضائیہ کا نشان:

پاک فضائیہ کا نشان ایک پانچ کونوں والے ستارے کے نیچے بنے دائرے میں موجود شاہین پر مشتمل ہے۔ دائرے کے اوپری حصہ پر انگریزی میں پاکستان اور نیچے کے حصہ میں ایئر فورس لکھا ہے۔ دائرے کے نیچے ایک لہر دار پٹی ہے۔ اس پٹی پر اردو زبان میں ''پاک فضائیہ اسلامی جمہوریہ پاکستان'' لکھا ہے۔

طیاروں پر گول نشان:

پاک فضائیہ کے جہازوں پر ایک گول نشان ہوتا ہے۔ یہ نشان پاکستان کے پرچم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس گول نشان کا بیرونی حصہ سبز اور اندرونی حصہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ یوں تو پاکستان کا قومی پرندہ چکور ہے، لیکن پاک فضائیہ کے جوان شاہین کہلاتے ہیں۔

پاک فضائیہ کی درس گاہ:

پاکستان ایئر فورس اکیڈمی ایک عسکری درس گاہ ہے۔ یہ پاک فضائیہ کے افسران کو تعلیم مہیا کرتی ہے۔ یہ اکیڈمی پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع نوشہرہ کے علاقے رسالپور میں واقع ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 13 اپریل 1948ء کو پاک فضائیہ کی رسالپور اکیڈمی میں فرمایا تھا: ''ایک طاقت ور ہوائی فوج کے بغیر ایک ملک کسی بھی جارح کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے

پاکستان کو اپنی فضائیہ بنا لینی چاہیے، یہ لازماً ایک بہترین ہوائی فوج ہو جو کسی دوسرے سے پیچھے نہ ہو۔''

پاک فضائیہ کے شاہینوں نے اپنے قائد کے ان الفاظ پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اب پاک فضائیہ دنیا کی بہترین ہوائی افواج میں شامل ہوتی ہے۔ اور کسی بھی طرح دیگر ممالک سے اپنے فضائی دفاع میں کمزور نہیں ہے۔

اللہ ہمارے ملک کو قائم و دائم رکھے آمین۔ پاکستان زندہ باد۔ ☆

مختصر کہانیاں

پودے ہمارے دوست

بتول فاطمہ لودھی

آمنہ شیراز اور انس احمد دونوں بہن بھائی تھے۔ آمنہ کلاس سوم اور انس ابھی اوّل کلاس میں تھا۔ آمنہ نے سکول میں پودوں کے بارے میں پڑھا تھا کہ پودے ہمیں خوراک دیتے ہیں اور سایہ مہیا کرتے ہیں اور کچھ پر خوبصورت پھول بھی اگتے ہیں جو اچھے لگتے ہیں۔ اس نے انس کو بھی بتایا تھا۔ دونوں بہن بھائیوں کو اپنے گھر میں پودے لگانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے چند پودے لانے کا کہا۔

وہ ان کے لیے گلاب کے پودے لے آئے۔

اپنے والد کی مدد سے انھوں نے گھر میں ایک کیاری بنائی اور اس میں یہ پودے لگا دیے۔ ابھی ان پودوں پر صرف پتے ہی تھے۔ انھوں نے شروع میں تو چند دن پانی روزانہ دیا۔ پھر اپنے کھیل کود میں مصروف ہو کر وہ پودوں کو بھول گئے۔ دنوں میں پودے سوکھ چکے تھے۔ ان کے والد کچھ دن تو دیکھتے رہے کہ شاید وہ خود پانی دینا شروع کر دیں۔ جب انھوں نے پودوں کو پانی نہیں دیا تو ایک دن آمنہ اور انس ان پودوں کے قریب کھیل رہے تھے، ان کے والد خود ہی ان پودوں کو پانی دینے لگے۔ جب دونوں بہن بھائی نے والد کو پودوں کو پانی دیتے دیکھا تو اُن کے قریب آ گئے اور بولے۔

''ابو جان! آپ کیوں پانی دے رہے ہیں؟ ہم دے دیں گے۔'' آمنہ نے کہا۔

''بیٹی آمنہ! پودوں کو پانی دینا بہت ضروری ہے اور روزانہ دینا چاہیے۔'' ابو نے بتایا۔

''کیوں ابو جان روزانہ پانی دینا کیوں ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ چھوٹا تھا لیکن بہت سوال کرتا تھا۔

''وہ اس لیے بیٹا کہ اگر ہم انھیں پانی نہیں دیں گے تو وہ مرجھا جائیں گے اور سوکھ جائیں گے۔'' انھوں نے انس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی پودا ہو، ہمیں اس سے آکسیجن ملتی ہے۔ پھلدار پودے پھل دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ پودے ہمارے دوست ہیں۔ اگر پودے نہیں ہوں گے تو ان کی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کیسے ملے گی۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے بات جاری رکھی۔

''جی ابو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' آمنہ نے ابو کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ وعدہ کریں کہ آپ ان پودوں کا خیال رکھیں گے۔'' ابو نے ان سے وعدہ لیا۔

''جی ابو ہم وعدہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال رکھیں گے۔'' دونوں نے وعدہ کیا۔

اس دن کے بعد سے دونوں نے ان پودوں کا بہت خیال رکھا اور وقت پر پانی بھی دینے لگے۔ چند دن کے بعد ان پر گلابی گلابی چھوٹے چھوٹے پھول کھل اٹھے جن کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

السّلامُ علیکم

رشکِ حنا

بہت دن ہو گئے دادی جان نے کہانی نہیں سنائی تھی۔ آج بچے بہت ضد کر رہے تھے۔ علی تو دادی کی گود میں ہی جا بیٹھا کہ آج تو دادی جان کہانی ضرور سنائیں۔ اتنی دیر میں گھر میں کام کرنے والی آنٹی آ گئی۔ دادی نے اُسے سلام کیا اور بچے حیران ہو کر دادی کو دیکھنے لگے۔

''دادی جان آپ نے کیوں سلام کیا؟'' ''عجیب بات ہے، وہ کام والی ہے، ہماری نوکر ہے۔ اُسے آپ کو سلام کرنا چاہیے تھا۔ دادی جان کو علی کی بات سن کر افسوس ہوا اور حیرت بھی انہوں نے کہا: ''چلو بچو! آج تمھیں ایک حدیث بتاتے ہیں۔'' کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آپس میں سلام کو رواج دو۔''

''اس طرح ایک دوسرے کو بہت پیاری دعا دیتے ہیں اور کیا آپ کو معلوم ہے السّلامُ علیکم کے کیا معنی ہیں؟''

بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا:

''نہیں، دادی ماں ہمیں تو نہیں معلوم آپ بتا دیں۔'' دادی جان مسکرا کر بولیں:

''السّلامُ علیکم کے معنی ہیں آپ پر سلامتی ہو۔ کتنی پیاری دعا ہے نا؟ بیٹا! یہ کہہ کر ہم ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔ سلامتی کا مطلب ہے peace، امن ہو جائے آپ پر اور کوئی چیز آپ کو کسی بھی طرح تنگ نہ کرے اور نہ آپ پریشان ہوں۔''

''اب آپ سب آرام سے بیٹھ جائیں میں آپ کو کہانی سناتی ہوں۔''

بچے فوراً دادی کے گرد جمع ہو گئے۔

''ایک بچہ عثمان نماز پڑھنے جاتا تھا۔ وہ ہر بار اپنی گلی سے گزرتے ہوئے ایک بچے کو گھر کے سامنے چبوترے پر بیٹھا دیکھتا۔ وہ لوگ نئے آئے تھے اس گھر میں، اس کو کسی کے ساتھ کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ عثمان مسجد آنے جانے کے دوران جب بھی اس بچے کو دیکھتا سلام کرتا۔ بچہ جواب دے دیتا اور دوسری طرف منہ کر لیتا۔ آخر ایک دن عثمان کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ مسجد نہیں جا سکا۔ جب دوسرے دن چلتے ہوئے اس بچے

کے پاس سے گزرا، تو اس بچے نے پہلے سلام کیا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں پھر بھی آپ مجھے کیوں سلام کرتے ہیں جب کہ میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں؟ تو بچو! معلوم ہے کہ عثمان نے کیا جواب دیا؟ عثمان نے کہا:

''بھائی آپ بھی میری عمر کے مسلمان بھائی ہیں اور آپ کو سلام کرنا میرے لیے نیکیوں کا باعث ہے کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپس میں سلام کو رواج دو یعنی سلام کو پھیلاؤ اور یہ دعا تو ہم ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ بچہ یہ سن کر بہت خوش ہوا کہنے لگا کہ ہماری جان پہچان بھی نہیں اور آپ نے مجھے اتنی اچھی دعا دے کر اپنا دوست بنالیا ہے، پھر دونوں دوست ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے اور ساتھ نماز پڑھنے جاتے اور کھیلتے بھی ساتھ تھے۔

''بچو! سلام کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ کیا آپ سیکھنا چاہیں گے کہ کیا آداب ہیں؟'' بچے پر جوش ہوئے ''جی جی بالکل دادی ہم ضرور سیکھیں گے۔'' دادی جان بولیں:

آداب یہ ہیں کہ جو کھڑا ہے وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو سوار ہے وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں۔ فون پر ہیلو کی بجائے السلام علیکم کہیں اور بچو! سلام کرنے سے دس نیکیاں ملتیں ہیں۔ آپ نے کسی کو سلام کیا اور دس نیکیاں/گولڈن سٹار زمل گئیں، کیا آپ کو معلوم ہے کب سلام نہیں کرنا چاہیے۔

''جب کوئی قرآن پڑھ رہا ہو یا کھانا کھا رہا ہو یا پھر کوئی باتھ روم میں نہا رہا ہو۔ اس موقع پر سلام نہیں کرنا چاہیے اور مسلمان کی نشانی ہے کہ وہ سب کو سلام کرے اور مصافحہ کرے۔''

دادی نے کہانی سنا کر بچوں کی طرف دیکھا تو عدنان سوچ میں گم نظر آیا۔

''بیٹے کیا ہوا؟''

اس نے کہا ''دادی جان! آپ نے بتایا کہ سلام کریں، مگر کس کو سلام کریں؟''

دادی جان نے کہا: ''سب کو سلام کریں، چاہے آپ انہیں جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ سب کو ضرور سلام کریں اور زور سے سلام کریں۔

''آہا! سب بچے اچھل پڑے۔ سب کی آواز آئی۔ ہم یہ ضرور کریں گے ہم سب کو سلام ضرور کریں گے ان شاءاللہ۔''

پر اور پیر

انیسہ زہرا

ایک جنگل میں ایک مور اپنے ماں باپ کے ساتھ خوشی خوشی رہتا تھا۔ مور بہت خوبصورت تھا اور اس کے پر بھی بہت ہی شاندار تھے یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے پروں پر بہت ناز کرتا تھا۔ وہ جب گھر سے باہر نکلتا تو جنگل کے تمام جانوروں کو اپنے خوبصورت پر دکھانے کی نیت سے سب کے سامنے ناچتا اور سب اس کے پروں کی خوب تعریف کرتے۔ مور اپنے پروں کی تو تعریف کرتا، لیکن اپنی ماں سے ہمیشہ اپنے پیروں کی بدصورتی کی شکایت کرتا، ہر وقت اپنے پیروں کو کوستا۔ مور یہ خیال ظاہر کرتا کہ وہ بہت خوبصورت ہے اپنے پروں کی وجہ سے، مگر اُس کے پیروں کی وجہ سے یہ خوبصورتی ماند پڑتی ہے۔ مور کی ماں ہمیشہ اُسے سمجھاتی کہ ہمارے جسم کا ہر عضو ایک نعمت ہے اور ہمارے لیے اہمیت کا حامل ہے، لیکن وہ ماں کی بات ماننے کے بجائے ہمیشہ ناشکرا پن کرتا۔

ایک دن مور اپنے پروں پر ناز کرتا ہوا ناچ رہا تھا اور تمام جانور اُس کا ناچ دیکھ رہے تھے۔ ناچ دیکھنے کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے لیکن مور کا دل نہیں بھرا اور وہ ناچتے ناچتے جنگل میں بہت دور نکل گیا۔ اس وقت جنگل میں ایک شکاری شکار کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ وہ بھی اتفاق سے اسی طرف نکل آیا جہاں مور ناچ رہا تھا۔ جب شکاری نے اتنے خوبصورت پروں والے مور کو دیکھا تو فوراً اسے پکڑنے کے لیے اُس کے قریب آیا۔ مور نے خطرہ بھانپ لیا اور تیزی سے دوڑتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ شکاری مور جیسی رفتار نہ رکھتا تھا اس لیے مور کا پیچھا کرتے ہوئے وہ راستہ بھٹک گیا۔ مور نے گھر آتے ہی اپنی ماں کو یہ قصہ سنایا۔ ماں نے مور سے کہا:

''دیکھا! جن پروں کی تم تعریف کرتے تھے اور ناز سے اتراتے پھرتے تھے آج اُن کی وجہ سے تم مشکل میں پھنس گئے اور جن پیروں کو تم برا کہتے تھے آج ان ہی کی بدولت تم نے اپنی جان بچائی۔''

''پیارے! بچو ہماری زندگی میں بھی ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جب ہمیں اپنی چیزیں، تعلقات اور حالات برے لگ رہے ہوتے ہیں، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے لیے کتنے فائدہ مند ہیں اور جن چیزوں، تعلقات، اور حالات و واقعات کو ہم اچھا سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے کس قدر نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ہمیشہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کریں اور اس سے ہمیشہ دعا گو کرتے رہیں۔''

چیکو کا تالاب

سلمان یوسف سمیجہ

چیکو ایک پیاری اور موٹی تازی سی بطخ تھی۔ وہ ایک بڑے سے تالاب میں رہتی تھی۔ تالاب کا پانی بے حد صاف شفاف تھا۔ چیکو اپنی پیاری آواز میں قیں قیں کر کے ماحول کو خوش گوار بنائے رکھتی تھی مگر جس تالاب میں وہ رہتی تھی۔ اُسے اپنی ملکیت سمجھا ہوا تھا۔ تبھی وہ اکثر باقی بطخوں کو مارتی رہتی تھی۔ وہ چوں کہ طاقت ور تھی اور باقی بطخیں اس کے مقابلے میں کمزور تھیں۔ وہ بطخیں چیکو کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی لیے اس تالاب میں اس کی حکومت قائم تھی۔ ایک روز اس نے بلاوجہ بنی بطخ کو بہت مارا، تو بنی سسکتے ہوئے بولی:

''تم ہم کمزور بطخوں کو کیوں بلاوجہ مارتی ہو؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''خاموش ہو جا بینی! ورنہ تالاب بدر کر دوں گی۔ یہ میرا تالاب ہے، میری مرضی میں جو بھی کروں۔'' چیکو اُسے چونچ مارتے ہوئے بولی۔

''تم نے یہ خریدا ہوا ہے کیا؟ یہ ہم سب بطخوں کا مشترکہ تالاب ہے۔'' بینی اس بار تلملا کر بولی۔

''میرے سامنے زبان چلا رہی ہو۔'' چیکو اُسے مارتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ صرف اور صرف میرا تالاب ہے۔'' پھر بینی نے بمشکل اس سے اپنی جان چھڑوائی تھی۔ اب چیکو سوچنے لگی کہ مجھے ان تمام بطخوں کو اس تالاب سے نکال دینا چاہیے تاکہ میں اکیلی اس تالاب میں خوب مزے اور آرام سے رہوں۔ دوسرے دن اس نے سب تیرتی بطخوں کو اکٹھا کیا اور بولی:

''یہ تالاب میرا ہے، تم سب یہاں سے نکل جاؤ۔ میں یہاں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔'' چیکو نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ سب بطخیں ہکا بکا رہ گئیں۔

''ایسا تو مت کرو چیکو! یہ تالاب ہمارا بھی تو ہے، ہمارا اس پر حق ہے۔''

میمی بطخ پریشان ہو کر بولی۔

''نہیں یہ میرا تالاب ہے۔ تم سب یہاں سے چلتی بنو۔'' چیکو غصے سے بولی۔

''ایسا مت کرو۔'' کمزور بطخیں رو رہی تھیں۔ چیکو کو ان پر تھوڑا سا بھی ترس نہیں آیا وہ پھر بولی:

''تمہارے رونے دھونے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ادھر سے کہیں اور جا کے رو لینا۔'' آخر چیکو نے ان سب کو تالاب سے نکال کر ہی دم لیا۔ ساری بطخیں منہ لٹکائے انجانی منزل کی جانب چل دیں۔ چیکو اُنہیں نکال کر بہت خوش تھی۔ اب وہ مزے سے تالاب میں رہتی قیں قیں کرتے ہوئے تیرتی۔ کچھ دن تو وہ آرام سے رہی مگر پھر اُسے تالاب میں کچھ خالی پن اور گہری خاموشی کا احساس ہوا۔ وہ اکیلے رہ رہ کر بور ہو جاتی۔ کسی سے باتیں نہ کر پاتی۔ وہاں کوئی ہوتا تو وہ اس سے باتیں کرتی نا۔ خاموشی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی وہ ہر وقت اداس رہتی۔ کاش میں ان بطخوں کو یہاں سے نہ نکالتی، بے چاری بطخیں نہ جانے کہاں ہوں گی۔

ایک روز اس نے مایوسی سے سوچا میں اکیلی رہ گئی ہوں، میرے ساتھ کوئی نہیں ہے یہ سب میری غلطی کا نتیجہ ہے۔ وہ خود سے بولی کاش! وہ ساری بطخیں دوبارہ اس تالاب میں آ جائیں، تو یہاں پہلے جیسی رونق ہو جائے۔ اس نے دکھ سے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر اس نے آنکھیں کھول کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ''یا اللہ سب بطخیں یہاں دوبارہ واپس آ جائیں۔'' اس نے دعا کی۔ اچانک آواز آئی:

''چیکو بہن کیا دعا مانگ رہی ہو۔'' اس نے آواز کی سمت دیکھا بیکی چڑیا اڑ رہی تھی۔ چیکو نے دکھی انداز میں اسے سب کچھ بتایا۔ ''وہ ساری بطخیں تو یہاں قریب ہی ایک تالاب میں رہتی ہیں۔'' بیکی چڑیا نے اُسے بتایا۔ ''اچھا! میں جا کر ان کو منا کر لاؤں گی۔''

''بیکی بہن! بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے یہ بتایا۔'' چیکو خوش ہو کر بولی، تو بیکی مسکرا دی۔ دوسرے دن چیکو قریبی تالاب میں گئی ان بطخوں سے معافی مانگ کر انہیں منا لائی اور بولی:

''یہ ہم سب کا تالاب ہے، ہم سب کا گھر ہے۔''

کمزور بطخیں بے انتہا خوش ہو گئیں، اب اس تالاب میں پہلے جیسے رونق لگی رہتی ہے۔

بی چڑیا اور بھورا کوا

صائمہ مسلم

ایک پیڑ کی ٹہنی پر بہت ہی خوبصورت سی بی چڑیا رہتی تھی۔ وہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ صاف دل کی مالک بھی تھی۔ ہر کسی کی مدد کرنے کو ہر دم تیار رہتی تھی۔ اپنی خوبصورتی پر کبھی گھمنڈ نہیں کرتی تھی۔ غرور اور تکبر کرنے والوں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ قریب ہی ایک بڑے سے درخت کی شاخ پر ایک بھورے رنگ کا کوا اپنے گھونسلے میں رہتا تھا۔

کوا بی چڑیا کی خوبصورتی سے بہت جلتا تھا۔ ہر وقت بی چڑیا کو نقصان پہنچانے کی تگ و دو میں لگا رہتا تھا۔ بی چڑیا اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور بھورے کوے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ (ایسا بھورے کوے کو لگتا) جس کی وجہ سے بھورے کوے کو اپنا آپ بہت حقیر لگنے لگا تھا اور وہ اس کا ذمہ دار بی چڑیا کو سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خوبصورت بی چڑیا سے خار کھانے لگا۔

کچھ دن بی چڑیا اپنے گھر سے باہر نہیں نکلی۔ بھورے کوے کو جب خبر ہوئی کہ بی چڑیا کہیں آتی جاتی نہیں تو، بھورے کوے کو یہ بات ہضم نہ ہوئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کس طرح پتا کرے کہ بی چڑیا اپنے گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتی۔ ایک دن بی چڑیا گھر سے باہر نکلی تو کوے کو موقع ملا اور وہ چڑیا کے گھونسلے میں گھس کر یہ دیکھنے لگا کہ آخر بی چڑیا ہر وقت گھونسلے میں گھس کر کیا کرتی ہے۔

بی چڑیا نے کچھ انڈے جمع کیے تھے جن کا وہ بہت زیادہ خیال رکھتی تھی۔ اسے اپنے آپ سے زیادہ اپنے پیارے انڈوں کی فکر لاحق رہتی تھی۔ ایک دن بی چڑیا کو بہت زور کی بھوک لگی۔ اس وقت اس کے پاس کھانے کو ایک دانہ بھی نہ تھا۔ بھوک سے اُس کی حالت ابتر ہو گئی۔ چار و ناچار بی چڑیا کو اپنے لیے دانہ لینے جانا پڑا۔ دس منٹ ہی گزرے تھے۔ جب بی چڑیا واپس اپنے گھر آئی تو اس کے دو انڈے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بی چڑیا یہ دیکھ کر بہت افسردہ ہوئی اور خود کو کوسنے لگی کہ آخر کیوں گئی دانہ لینے۔ بی چڑیا کا دکھ تھوڑا کم ہوا تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ ہی خیال آیا کہ ہونا ہو یہ حرکت اس بھورے کوے کی ہوگی۔ جب چڑیا کے گھونسلے میں گھس کر دیکھنا چاہ رہا تھا تب ہی بے دھیانی میں دو انڈے

ٹوٹ گئے اور کوا ڈر سے فوراً باہر نکل کر دور کہیں اڑ گیا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بی چڑیا نے ایک ترکیب لڑائی اور دانہ لینے کے بہانے اپنے گھر سے باہر نکل گئی۔ ابھی اسے گئے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ بھورا کوا مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بی چڑیا کے گھر میں چونچ گھسا کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ تب ہی کوے کی چونچ سے کچھ ٹکرایا۔ کوے نے پھر زور سے گھونسلے کے اندر چونچ ماری۔ انڈا تو نہ پھوٹا بلکہ بھورے کوے کی چونچ پر زور سے چوٹ لگی۔ بھورا کوا کراہتے ہوئے پیچھے ہوا پر ناکام رہا۔ بہت کوشش کی پر چونچ بی چڑیا کے گھر سے نکال نہ سکا۔ یہ ساری کارروائی دور دوسرے درخت پر بیٹھی بی چڑیا دیکھ رہی تھی۔ اُس نے پھر اپنے گھر کے پاس آ کر بھورے کوے کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔ کوے کو اپنی بے وقوفی پر بہت افسوس ہوا اور وہ ندامت سے سر جھکائے بی چڑیا سے معذرت کرنے لگا۔ بی چڑیا بڑے دل والی تھی۔ بی چڑیا نے بھورے کوے کو معاف کر دیا اور اسے اپنے گھر سے چونچ باہر نکالنے میں مدد کی۔ بھورے کوے کی جھکی نظروں میں ندامت کے آنسو ٹپکتے دیکھ کر بی چڑیا کو کوے سے ہمدردی سی ہوئی۔ اس نے کوے سے جاننا چاہا کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔ تب کوے نے بتایا کہ وہ اُس کی خوبصورتی سے حسد کرتا تھا۔ بی چڑیا نے کوے کو سمجھایا اور اسے بتایا کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں یہ معنی نہیں رکھتا بلکہ آپ خود کو کس نظر سے دیکھتے ہیں یہ اہم ہے۔ پھر بھورے کوے نے خود سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ کبھی بھی بی چڑیا کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ لوگوں کی حقارت بھری نظروں (جو کہ بھورے کوے کا وہم تھا) کو خاطر میں نہ لائے گا۔ خود کو کبھی بھی دوسروں کی نظر سے نہیں پرکھے گا۔ بی چڑیا کے ساتھ مل جل کر رہے گا۔

گمشدہ پینسل

نبیل احمد

ایک صبح میں اور میری چھوٹی بہن اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اس وقت امی باورچی خانے میں ہمارے لیے ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔ میں نے اپنی چیزیں سمیٹنے کی کوشش کی تاکہ اسکول کے لیے اپنا بستہ باندھوں مگر مجھے میری پینسل نہیں مل رہی تھی۔

''کیا کسی نے میری پینسل دیکھی ہے؟'' میں نے پوچھا، لیکن کسی نے میرے سوال کی طرف توجہ نہیں دی۔ جیسے میں ہواؤں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تو میں نے پینسل ڈھونڈنے کو بہتر سمجھا مگر مجھے میری پینسل نہیں ملی۔ مجھے غصہ آیا میں نے اپنی بہن سے پوچھا: ''کیا تم نے میری پینسل دیکھی ہے؟''

میری بہن بھی شدید غصے سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگی:

''کیا آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ آپ کی پینسل میں نے اٹھائی ہے؟'' غصہ اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ ''یہ تو تم خود کہہ رہی ہو۔ میں نے نہیں کہا۔''

میری بہن میری بات کو نظر انداز کر کے مزید غصے میں کہنے لگی:

''بغیر ثبوت کے خبردار مجھ پر الزام نہ لگانا۔''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا، تو میں نے بھی نکیلے جملے کستے ہوئے کہا:

''تمہارے علاوہ کسی اور کو پینسل کی کیا ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس گھر میں ایک تم ہی ہو جو بغیر اجازت ہر کسی کی چیزیں اٹھا لیتی ہو۔''

''چپ رہو'' میری بہن غصے سے آگ بگولا ہوئی۔

''میں بول تو رہی ہوں کہ میں نے آپ کی پینسل نہیں اٹھائی۔''

امی باورچی خانے سے ناشتا لے کر نکل رہی تھیں کہ ان کی نظر ہم دونوں پر پڑی کیوں کہ ہم نے گھر سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ امی نے ہم دونوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

''بس بند کرو یہ جھگڑا میں تمہیں نئی پینسل دلا دوں گی۔ اب بیٹھ کر ناشتا کر لو ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

ہم دونوں خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔

ناشتا ختم کر کے ہم دونوں اسکول کے لیے نکلے، مگر ایک دوسرے سے خفا تھے۔ اس لیے سارا راستہ ہم نے ایک دوسرے سے بات تک نہ کی۔ اسی دن شام کو جب میں اپنی میز کی دراز کی صفائی کر رہا تھا۔ ایک لفافے کے پیچھے کچھ دکھائی دیا۔ جب میں نے لفافہ اٹھایا تو میری نظر اس گمشدہ پینسل پر پڑی۔

ایک طرف تو مجھے پینسل ملنے کی خوشی ہوئی لیکن دوسری طرف میں اپنی بہن سے کیے گئے برتاؤ اور اپنے رویے پر بہت شرمندہ بھی تھا۔

میں نے اپنی بہن سے معافی مانگی اور اسے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

سبق: مسئلہ دوسروں کے ساتھ نہیں ہوتا جیسے آپ سوچتے ہیں کبھی کبھار مسئلہ آپ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ خود کی اصلاح کریں۔

جنت

آسیہ علی

''اُف! میرا جنت میں جانے کا خواب کب پورا ہوگا؟ وہاں میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کروں گا۔ نہ پڑھائی کی ٹینشن نہ ہوم ورک کی فکر بس راحت ہی راحت۔''

احمد جو پانچویں کلاس کا طالب علم تھا سوچوں کے بھنور میں ڈوبا جنت میں جانے کے پلان بنا رہا تھا۔ تب ہی اسے گھر کے داخلی دروازے سے کچھ مہمان اندر داخل ہوتے دکھائی دیے تو وہ بے دلی سے اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا اور گھر کے قریبی پارک کے سنگی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔

.....☆.....

ایک ننھے سفید بادل کا ٹکڑا اٹکھیلیاں کرتا، ہوا کے سنگ اڑتا چلا جا رہا تھا۔ یوں ہی پھرتے پھراتے وہ پارک والی سائیڈ پر آ گیا۔ پارک میں اونچے اونچے درخت اور سرسبز زمین اسے بہت پسند آئی۔ اسی لیے اس نے ادھر ہی اڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے نکلتا اس کی نظر پارک میں بیٹھے ایک اداس لڑکے پر پڑی تو بادل کا تجسس بڑھا۔ وہ احمد کے پاس آیا اور بولا:

''کیا ہوا پیارے لڑکے؟ ادھر کیوں اداس بیٹھے ہو؟''

بادل کا سوال سن کر احمد نے اسے بتانے کا ارادہ کیا۔ پھر بولا:

''میں جنت میں جانا چاہتا ہوں، مگر جنت میں جانے کا طریقہ نہیں معلوم میں کیا کروں؟'' احمد نے منہ بسورتے بادل کو جواب دیا، تو بادل کو اس کی معصوم سی خواہش سن کر ہنسی آ گئی۔

''ارے تو اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے میرے ننھے منے دوست! تمہارے پاس ہے تو صحیح جنت پھر کاہے کو پریشان ہو رہے ہو؟'' بادل نے اس کے سر پر گول گول گھومتے جواب دیا، تو احمد حیران ہو کر رہ گیا۔ ''کک کیا مطلب میرے پاس جنت کہاں ہے؟'' مارے خوشی کے احمد کی آواز کانپ رہی تھی۔

''جس سے تم دور بھاگتے ہو میرے پیارے دوست۔'' بادل نے احمد کا تجسس برقرار رکھنا چاہا۔

''مجھے سیدھی طرح بتا دو کیوں تنگ کر رہے ہو۔ کیا پتا تم بھی سب کی طرح مجھے بہلانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہے ہو۔ میں ایسے ہی تمہاری باتوں میں آ رہا ہوں۔''

احمد کی اداسی مزید بڑھ گئی۔ وہ بدگمان ہوتا اٹھ کر گھر جانے لگا تب بادل نے بھی اسے تنگ کرنے کا ارادہ ترک کیا اور بولا:

''اچھا پیارے لڑکے! رکو میں تمہیں تمہاری جنت کا پتا بتا دیتا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ تم میری پوری بات تسلی سے سمجھ کر سنو گے۔ بولو منظور ہے؟''

بادل نے تمہید باندھی۔ احمد کو اور کیا چاہیے تھا بھلا اس کا دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ احمد حیران پریشان اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے ہاں میں سر ہلاتا دوبارہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ بادل نے ایک دفعہ پھر یقین دہانی کرنے کو پوچھا: ''سچ؟''

''بالکل سچ پیارے بادل جلدی سے مجھے میری جنت کا پتا بتا دو۔ میں پوری تسلی سے بات سننے کو تیار ہوں۔'' احمد نے جوش سے کہا۔

''تم اپنی اسلامیات کی کتاب کو توجہ سے پڑھا کرو۔ تمہیں تمہاری جنت مل جائے گی۔'' بادل کی بات سن کر احمد نے نہ سمجھنے والے انداز میں بادل کی طرف دیکھا۔ جب بادل مزید بولا:

''اب گھر جاؤ تمہاری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

احمد بادل کی بات سن کر مایوسی سے اٹھ کر گھر جانے والے رستے کی جانب چل دیا، کیوں کہ اسے بادل کی بات سمجھ جو نہ آئی تھی۔

.....☆.....

گھر آیا تو مہمان جا چکے تھے۔ اس کی امی نے اسے گھر داخل ہوتے دیکھا تو بولیں:

''احمد بیٹے لنچ کے لیے آ جاؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔''

احمد نے سنا اور بے دلی سے ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آ گیا۔ کھانا دیکھ کر بڑبڑایا۔

''جنت میں اس سے بھی زیادہ اچھے ذائقے والے اور طرح طرح کے کھانے ہوں گے۔''

''کیا ہوں گے؟'' احمد کی امی کو جتنی سمجھ آئی تھی انہوں نے اس کے مطابق سوال کیا۔

''کچھ نہیں آپ تو مجھے آرام سے بیٹھ کر کچھ سوچنے بھی نہیں دیتیں۔''

احمد نے بدتمیزی سے جواب دیا اور کھانا ٹھیک سے کھائے بغیر ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''یا اللہ پاک میرے بیٹے کو ہدایت دے اسے کیا ہو گیا ہے؟''

احمد کی بات سے اس کی امی نے دلبرداشتہ ہو کر دعا کی اور کھانے کے برتن اٹھانے لگ گئی۔

.....☆.....

کافی دن ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن اسکول میں احمد سر کھجاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے میں مگن تھا۔ کتاب سامنے کھلی پڑی تھی۔ اس کا سبق میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

''سبق پر توجہ دو۔ استاد صاحب نے دیکھا تو پٹائی لگے گی۔'' ساتھ بیٹھے رضا نے اسے سرگوشی میں خبردار کیا تو احمد نے بھی چونک کر اپنی کتاب پر نظریں جما لیں۔

''ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔''

کتاب پر نظر جماتے ہی اس کی نظر جس فقرے پر پڑی وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔ وہ کم عقل تو تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اس جملے کا مطلب نہ سمجھ پاتا۔ تب اس کے ذہن میں کچھ خیال آیا تو اسے پارک میں بیٹھے اپنے بادل دوست کی بات یاد آ گئی۔

گھر آتے ہوئے رستے میں وہ یہ ہی بات سوچ رہا تھا کہ ''جنت میرے گھر میں ہے میرے سب سے زیادہ قریب اور میں پہچان ہی نہیں پایا۔ الٹا اپنے برے رویے سے اپنی ماں کو دکھ دینے کا سبب بنتا رہا۔ یا اللہ پاک مجھے معاف کر دے۔ میں آئندہ کبھی اپنی جنت کو تکلیف نہیں دوں گا ان شاء اللہ۔''

احمد نے سچے دل سے عہد کیا اور جلدی جلدی گھر کی راہ لی۔ آخر کو اسے گھر جا کر اپنی ماں اپنی جنت سے اپنی بدتمیزی کی معافی بھی تو مانگنی تھی۔

شازیہ ستار نایاب

بارش

آئے کالے کالے بادل
چھائے کالے کالے بادل

جھومے بادل گرجے بادل
دھرتی ہوئی جل تھل جل تھل

پھولوں کے چہرے پر پانی
باغوں کے بیلے میں پانی

بچے بالے بھیگے بھیگے
کاغذ کی ناؤ سے کھیلے

پتوں کی پائل جو چھنکی
پنچھی چہکے کوئل کوکی

مٹی کی خوشبو بھی پھیلی
مہکی مہکی سوندھی سوندھی

گرمی بھاگی برسی بارش
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ چھم چھم چھم چھم

میچک

ولید عبداللہ

''یار یہ آپ کیا ہر وقت کتابوں میں منہ دیے رہتے ہو، رکھو یہ اور آؤ لوڈو کھیلتے ہیں۔'' حماد نے طلال سے کتاب کھینچتے ہوئے کہا جو کتاب میں منہ دیے اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا، ''تم بھی نا..... چھوڑو'' طلال نے بیزاری سے اُس سے کتاب چھڑوائی اور ایک غصیلی نظر اُس پر ڈال کر پھر سے کتاب پڑھنے میں مگن ہو گیا۔

جبکہ حماد خفا ہو کر اُس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا اور خود ہی لوڈو کھیلنے لگا، طلال نے کوئی توجہ نہیں دی اور جب کتاب کا باب ختم کیا تو کتاب رکھ دی اور حماد کی طرف منہ کر کے اُسے منانے لگا۔

''یار خفا نہ ہونا..... میں جب مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں تو کوئی بیچ میں ڈسٹرب کرے، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

حماد نے اُس کی باتوں پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور یوں ہی دوسری طرح منہ کر کے بیٹھا رہا۔

''یار! اب بس بھی کرو، عورتوں کی طرح کب تک منہ بسورے بیٹھے رہو گے؟''

حماد اب بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔

''بھئی آج تو پہلی باری میں ہی لوں گا اور پہلی گوٹی میری ہی کھلے گی، دیکھنا۔''

طلال نے ڈائس لے کر کہا کہ اُسے پتا تھا حماد کو کیسے منٹوں میں منایا جا سکتا ہے۔

جیسے ہی اُس نے ڈائس لی حماد فوراً اُس پر جھپٹ پڑا اور اُس سے ڈائس لے لی۔

''نہیں نہیں! پہلی باری تو میں ہی لوں گا۔''

طلال ہلکے سے ہنسا اور خاموشی سے کھیلنے لگا۔

جیسے ہی گیم ختم ہوئی طلال نے پھر سے کتاب کھولی اور مطالعہ شروع کیا جسے دیکھ کر حماد نے ناک سکیڑی۔

حماد اور طلال بہت اچھے دوست تھے، ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے اور دونوں ہی بہت ذہین تھے۔ اُن دونوں کے خیالات ہر لحاظ سے ملتے تھے سوائے پڑھائی اور مطالعہ کو لے کر۔ طلال کو پڑھائی اور مطالعہ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ ہر وقت بس کتابوں کے ساتھ وقت گزارتا، گھر پر ہو یا اسکول وہ بس کتابوں میں منہ دیے بیٹھا رہتا۔ اُسے دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود سے کوئی سروکار نہیں تھا یہاں تک کہ وہ کھانا پینا تک بھول جاتا اور وہ خود ہی کہتا تھا کہ کتابیں ہی میری خوراک ہے۔ اُس کے دوست اکثر اُس کو باہر گھومنے کے لیے کہتے مگر اُنہیں کیا پتا تھا کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر کتابوں کے ذریعے دنیا جہاں کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ طلال کوئی افلاطون نہیں تھا لیکن مطالعہ ہی اُسے ہر کہیں اسکول ہو یا کلاس، سب سے نمایاں کرتا۔ وہ سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا، وہ صبح کو کوئی کتاب شروع کرتا تھا اور شام سے پہلے پڑھ چکا ہوتا۔

جب کہ دوسری طرف حماد جس کو کتابوں سے ایسے ڈر لگتا جیسے پتا نہیں ہاتھ لگانے پر وہ اُسے کاٹ لے گی، گویا الرجی تھی اُسے کتابوں سے، وہ ہر وقت کھیل کود اور شرارتوں میں لگا رہتا تھا، اور یہی وجہ تھی اُس کے لاکھ ذہین ہونے کے باوجود مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے اکثر ایک یا دو پیپرز میں فیل تک ہو جاتا تھا۔

طلال کی ہزار ہا نصیحتوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اور آخر کار اُسے چپ سادھنی پڑی۔ طلال کے نصیحت پر حماد ہر بار کہتا تھا کہ "ایک آپ ہی کافی ہو کتابی کیڑا، مجھے نہیں بننا۔"

وہ خود تو پڑھتا تھا نہیں اور طلال کے پڑھنے سے بھی اُسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ہر بار اُس کی کتاب جھپٹ لیتا اور کھیلنے کا کہتا جس پر طلال غصہ کرتا۔

"ویسے..... ان کتابوں میں ایسا بھی کیا ہے؟"

حماد نے لوڈو کھیلتے کھیلتے اچانک طلال سے مخاطب ہو کر پوچھا جس پر طلال نے کتاب سے نظریں ہٹا کر کہا:

"میجک، جادو، جادو ہے کتابوں میں۔"

جس پر حماد نے ایک عجیب سی شکل بنائی اور زیرِ لب دُہرایا "میجک، جادو؟"

"کیسا میجک کیسا جادو؟ آپ اتنی کتابیں پڑھتے ہو، ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا آپ نے کوئی جادو کا مظاہرہ کیا ہو۔"

حماد نے ناک چڑھا کر کہا۔

"دیکھو! یہ میجک ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا، نہ ہی محسوس کر سکتا ہے، علاوہ پڑھنے والے کے۔"

طلال نے جیسے جتا کر کہا جس پر حماد حیران ہوا، کیوں کہ کتابوں کے ساتھ تو اُس کی سلام دعا ہوتی نہیں تھی، اب اُسے کیا معلوم تھا ان سب کے بارے میں۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور کہا:

"تو ٹھیک ہے آج میں بھی پڑھوں گا کتاب اور دیکھتے ہیں کیسا میجک ہے یہ۔"

طلال ہلکے سے مسکرا دیا اور پاس پڑے بیگ سے ایک رسالہ نکال کر اُسے پکڑایا۔

"ہاں جی ضرور پڑھ کے خود دیکھ لینا میجک۔"

"نہیں مجھے وہی کتاب چاہیے جو آپ پڑھ رہے ہو جس میں میجک ہے۔" حماد نے اُس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کیا جو وہ ابھی پڑھ رہا تھا۔

"میجک صرف اس کتاب میں نہیں، بلکہ دنیا کی ہر کتاب میں میجک ہے۔"

طلال نے کہتے ہوئے رسالہ اُسے پکڑایا اور کتاب خود پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

.....☆.....

حماد جیسے ہی گھر آیا، اپنے کمرے میں جا کے خود کو بند کر لیا۔

رسالہ نکالا اور ہلکے سے ایک صفحہ پلٹا جیسے وہ ڈر رہا ہو، اُسے لگا جیسے رسالہ کھولتے ہی پتا نہیں میجک کیا کچھ کر دے گا، مگر اُس کی سوچ کے الٹ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بعد اُس نے ایک ایک صفحہ پلٹ پلٹ کے دیکھا اور خوب اطمینان کر لیا، وہاں کوئی میجک نہیں تھا۔

اُسے تھوڑی حیرانی ہوئی اور پڑھنا شروع کیا کہ شاید پڑھتے ہوئے اس میں جادو آ جائے۔ وہ ایک کے بعد ایک کہانیاں اور مضامین پڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک ہی رات میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا، مگر میجک نام کی کوئی چیز اُس نے دیکھی، نہ ہی سنی اور مایوس ہو کر سو گیا۔

اگلے دن وہ کافی طیش میں اسکول گیا۔ دل ہی دل میں وہ کیا کچھ سوچ چکا تھا طلال کے لیے، رسالہ ہاتھ میں لیے وہ کلاس روم میں داخل ہوا، آس پاس نگاہ دوڑائی مگر طلال کو نہیں پایا، تھوڑی دیر میں ٹیچر آیا اور کلاس شروع ہوئی، ٹیچر ہسٹری پڑھانے لگا۔

اکبر بادشاہ کون تھا؟

جیسے ہی ٹیچر نے سوال پوچھا سب سے پہلے حماد نے ہاتھ کھڑا کیا جس پر ٹیچر اور دوسرے طلبا سے زیادہ اُسے خود حیرانی ہوئی۔

جلال الدین اکبر سلطنتِ مغلیہ کا بادشاہ تھا اور شہنشاہ ہمایوں کا بیٹا تھا۔ اور اُن کی والدہ ایرانی خاتون تھیں جن کا نام حمیدہ بانو تھا۔

بجلی کے جھٹکے سب کو لگے جب حماد اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک ہی سانس میں رکے بغیر جلال الدین اکبر کی ساری معلومات دے ڈالیں جو کل اُس نے رسالے کے ایک مضمون میں پڑھی تھیں۔

اُستاد صاحب نے اُسے شاباش کہا اور کلاس ختم ہونے پر سب اُسے ہی دیکھتے رہے۔

طلال کے لیے جو غصہ وہ گھر سے لے کر آیا تھا اب وہ غائب ہو چکا تھا۔

اسی وقت طلال کہیں سے آیا، اُس کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر کہا:

"ہاں بھئی..... تو دیکھ لیا نا میجک۔"

اور وہ لاجواب اُسے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

بقیہ: ساشا اور کوکو

"بیٹا آپ پچھلے ایک گھنٹے سے سو رہی ہیں اور نیند میں مستقل "ساشا اور کوکو" بڑبڑا رہی ہیں، کون ہیں ساشا اور کوکو؟" زینی ہڑبڑا کر اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔ اپنے آس پاس دیکھا تو نہ ساشا تھا اور نہ کوکو اور نہ ہی کوئی کیک زینی نے بے یقینی سے کہا:

"تو کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟" سر ناصر مسکراتے ہوئے:

"جی بیٹا۔" زینی سر کی مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ سی گئی لیکن اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے اور حقیقت اس سے کوسوں دور ہے۔ اس بات کو کافی مہینے گزر چکے ہیں۔ اب بھی اکثر زینی ڈیسک کے نیچے دیکھنے لگتی ہے کہ شاید بونوں کا شہر اسے نظر جائے اور وہ ایک بار پھر ساشا اور کوکو سے مل سکے۔ ☆

لاڈلے

عنیزہ فضل داد

شہریار! کیا تمہیں پتا ہے آج مجھے اماں بتا رہی تھیں کے اللہ میاں ان بچوں کو بہت پسند کرتا ہے جو ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ دس سالہ شہریار اپنے سامنے بیٹھے دوست شاہ زیب کے ساتھ زمین پر پڑے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

''کیا واقعی میں؟''

شاہ زیب کھلونوں سے سر اٹھا کر شہریار کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

ہاں بالکل اور تمہیں پتا ہے اماں کہہ رہی تھیں کے جو بچے سچ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہر دعا قبول کر کے انہیں بہت سارے کھلونے دیتا ہے اور بہت ساری چیزیں بھی۔ شہریار اپنے چہرے پہ پر مسرت احساسات کو جگائے بولا۔

چیزیں، کھلونے ارے واہ! لیکن شاہ زیب کچھ کہتے کہتے رک گیا، تو سامنے کھلونوں سے کھیلتا شہریار کہنے لگا:

''لیکن کیا میرے دوست؟''

''لیکن ہم تو بہت مستیاں کرتے ہیں۔ اماں ابا کو تنگ بھی کرتے ہیں اور کھیل کھیل میں کئی بار جھوٹ بھی بول دیتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ ہم جیسے گندے بچوں کو بھی پسند کرے گا؟ کیا وہ ہمیں بھی بہت ساری چیزیں دے گا؟'' شاہ زیب اپنے چہرے پر دکھ بھرے تاثرات سجائے بولا۔

''شاہ زیب ایسا کرتے ہیں ہم مل کر اماں کے پاس چلتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں۔'' شاہ زیب یہ سنتے ہی یکدم کھڑا ہوا تو اس کی گود میں رکھے کھلونے زمین پر جا گرے۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر سیدھا اماں کے کمرے کی جانب دوڑے کمرے میں پہنچتے ہی دیکھتے ہیں کہ اماں نماز کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ وہ دونوں کمرے میں ایک کونے میں بچھے صوفے پر براجمان ہو کر اماں کی نماز مکمل ہونے کا بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں اماں جیسے ہی سلام پھیرتے ہوئے دکھائی دیں، تو وہ دونوں صوفے سے اچھل کر سیدھا اُن کے سامنے جا بیٹھے۔

''کیا ہوا میرے بچو! تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟'' شہریار کی والدہ ان کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ان پر دعائیں پڑھ کر پھونکتے بولیں، تو شہریار اماں کے ہاتھ چوم کر کہنے لگا:

''اماں! آپ نے بتایا تھا نا کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں سے محبت کرتا ہے جو ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔''

''جی اماں کی جان بالکل ایسا ہی ہے۔ چلو تم دونوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ میں تمہیں آج ایک کہانی سناتی ہوں۔''

کہانی کا نام سنتے ہی دونوں بچے خوشی خوشی اماں کے پاس بیٹھ گئے۔

''اچھا تو سنو! دو بہت ہی پیاری چھوٹی چھوٹی سی شہزادیوں جیسی دو بہنیں تھیں جن میں ایک کا نام حنا اور دوسری کا کرن تھا۔ دونوں ویسے تو بہت پیاری تھیں لیکن حنا کی ایک عادت ایسی تھی کے جس کی وجہ سے اُسے آئے دن اپنی امی سے ڈانٹ پڑتی رہتی اور جانتے ہو وہ عادت کیا تھی؟''

''نہیں'' دونوں نے ایک ساتھ سر کو نفی میں ہلایا تو جائے نماز پر بیٹھی شہریار کی والدہ مسکراتے ہوئے بولیں:

''میرے بچو! وہ عادت تھی جھوٹ کی۔ ان دونوں میں سے حنا کو جھوٹ بولنے کی بڑی ہی بری عادت تھی۔ ایک روز ان کی دادی ماں نے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور ہمیشہ سچ بولنے کی نصیحت کی جسے سننے کے تھوڑی دیر بعد ہی حنا ہمیشہ کی طرح بھول گئی۔ کچھ روز بعد جب دونوں بہنیں چھپن چھپائی کھیلنے لگیں تو حنا کی باری ڈھونڈنے کی طے ہوئی جبکہ کرن کو چھپنا تھا۔ کرن جب چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگی تو اسے کچھ سمجھ نہ آیا، تو وہ سامنے کھلی الماری میں جا گھسی جسے الماری میں جاتے ہوئے حنا نے دیکھ لیا تھا، لیکن پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے کی جھوٹ موٹ ایکٹنگ کرنے لگی۔ ابھی وہ کرن کو ڈھونڈ ہی رہی تھی کے اسے اماں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً ان کی جانب لپکی اور اس بات کو بھول گئی کہ کرن نے خود کو الماری میں بند کر رکھا ہے جو کے صرف باہر سے کھل سکتی تھی۔

کچھ گھنٹے گزر جانے کے بعد جب کرن گھر میں کسی کو نہ دکھائی دی تو گھر والوں میں ہلچل مچ گئی۔ سب پریشان حال اِدھر اُدھر کرن کو ڈھونڈنے لگے جب کہ کرن الماری میں بند تھی۔ یہ جانتے بوجھتے بھی اس ڈر سے کہ کہیں اماں ڈانٹے نہ حنا نے کسی کو یہ نہ بتایا کے کرن الماری میں بند ہے۔ ہر طرف رونا دھونا شروع ہو چکا تھا کیونکہ کرن کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اتنے میں کرن کے دادا نے تھانے میں ایف آئی آر کٹوانے کا فیصلہ کیا۔ جب کرن کی تصاویر نکالنے کے لیے الماری کھولی گئی تو الماری میں آخری سانسیں لیتی کرن کو دیکھ سب حیران رہ گئے۔ کرن کی حالت غیر ہو چکی تھی لیکن شکر ہے کہ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ کرن کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹرز نے بتایا کے وہ اسے صحیح وقت پر لے آئے ورنہ اگر چند منٹ کی دیر ہو جاتی تو وہ اسے شاید نہیں بچا پاتے۔ کرن کو اس حالت میں دیکھ کر حنا چلا چلا کر رونے لگی اور روتے روتے اس نے سب کو بتا دیا کہ اس نے جھوٹ کہا تھا کہ اسے نہیں پتا کرن کہاں ہے؟ جب کہ وہ جانتی تھی کے چھپن چھپائی کھیلتے وقت اس نے خود کو الماری میں بند کر تھا۔ اس کے ایک جھوٹ نے کرن کی کیا حالت کر دی تھی اور اب اس کا سچ بے معنی ہو چکا تھا جس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس لیے میرے پیارے بچو! ہمیشہ سچ بولنا سیکھو کیونکہ سچ انسان کو عزت بخشتا ہے جبکہ جھوٹ بولنے والا شخص کبھی سکون نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس انسان کو پسند کرتا ہے جو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ سچ بولنے والے بچوں کے لیے اللہ تعالیٰ بہت سارے تحائف بھیجتا ہے، ان سے پیار کرتا ہے اور ان کی ہر دعا قبول کرتا ہے۔''

''لیکن اماں اگر سچ بولنے پر ڈانٹ پڑے تو کیا تب جھوٹ بول سکتے ہیں؟'' شہریار اپنے معصوم چہرے کو اماں کی جانب پھیرتے ہوئے بولا۔ تو اس کے اس معصومانہ سوال پر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں:

''نہیں میرے پیارے بیٹے! دیکھو نا اگر اس ڈر کے باوجود کے سب اسے ڈانٹیں گے اگر حنا سچ کہہ دیتی تو کرن اس حال کو نہ پہنچتی۔ اسی لیے سچ بولنے پر اگر ڈانٹ بھی پڑ رہی ہو تو بھی ہمیشہ سچ بولنا چاہیے کیونکہ اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ تو پھر بتایئے کون کون سچ بولے گا آج سے؟''

''میں، میں، میں'' سامنے دوزانوں بیٹھے شہریار اور شاہ زیب اپنا ہاتھ اٹھاتے خوشی خوشی بولے تو شہریار کی اماں دونوں کے ماتھے چومتے ہوئے کہنے لگیں:

''تو پھر تم دونوں آج سے صرف میرے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھی لاڈلے ہو میرے بچو اور اللہ اپنے لاڈلوں کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیتا۔ ☆

بقیہ: سچا جھوٹ!

آنکھیں تھیں۔ روتے ہوئے بند ہو گئیں، صرف لکیریں رہ گئیں۔ یہ وقت بڑی مشکل سے گزرا۔ آخر اس کے معافی مانگنے پر اسے کھڑا ہونے کا حکم جاری ہوا۔ وہ کانپتی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹے اپنی زبان کو قابو میں رکھتے ہیں۔ بولنے سے پہلے سوچتے ہیں۔ کون سی بات کب اور کیسے کرنا ہے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔'' اس کے پاپا نے نرمی سے کہا:

''آج کا سبق یہ ہے کہ پہلے تولو پھر بولو۔'' اس کی ماما نے لقمہ دیا۔

''کچھ سچ ایسے ہوتے ہیں جو باعث فساد ہو جاتے ہیں انہیں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذاق میں کہی ہوئی بات کو جب آپ دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں تو اس کا مفہوم بدل جاتا ہے، یہ سچ ہوتے ہیں لیکن جھوٹ ہوتے ہیں، کیونکہ مذاق میں کہے گئے ہوتے ہیں۔''

''جی پاپا اور ماما آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔'' جنید نے سچے دل سے کہا۔

''اب جاؤ اور باہر کھیل لو۔'' اس کی ماما اور پاپا نے کہا تو جنید سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

☆.....☆.....☆

چُنّی چڑیا

نظیر فاطمہ

چڑا اپنے تینوں بچوں کے پاس گھونسلے میں بیٹھا تھا۔ صبح وہ اپنے بچوں کے لیے دانہ دنکا لایا، تو چنّی چڑیا ان کے پاس تھی اور اب چنّی چڑیا دانہ لینے گئی تھی تو چڑا بچوں کے پاس تھا۔ دونوں باری باری دانہ دنکا لینے جاتے تھے تاکہ کوئی ان کے بچوں کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ چنّی چڑیا کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ابھی تک وہ واپس نہیں آئی تھی۔ چڑے کو اس کی فکر ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر مزید گزری تو وہ واپس آ گئی۔ اس کی چونچ میں دانہ تھا جو اس نے باری باری اپنے تینوں بچوں کو کھلایا۔

''میں ابھی آتی ہوں تم بچوں کا خیال رکھنا۔'' چنّی چڑیا نے چڑے سے کہا اور پھر سے اُڑ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ گھونسلے میں آئی تو اس کی چونچ باجرے کے دانوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے وہ دانے اپنے گھونسلے میں ایک طرف رکھ دیے۔

''یہ دانے یہاں کیوں رکھ دیے ہیں؟'' چڑے نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں دانہ دنکا زیادہ مقدار میں لایا کروں گی۔ کچھ بچوں کو کھلاؤں گی اور کچھ اپنے گھونسلے میں جمع کر لیا کروں گی تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آئے۔'' چنّی چڑیا پھدک کر چڑے کے برابر جا بیٹھی۔

''کیوں بھئی۔ تمھیں معلوم ہے نا کہ کھانا جمع کرنا ہم پرندوں کی فطرت میں نہیں ہے۔ ہم روز کے روز دانے کی تلاش میں نکلتے ہیں اور پیٹ بھر کر لوٹتے ہیں۔ یہ جمع کرنے والی انسانی خصلت تم میں کہاں سے آ گئی؟'' چڑے نے اسے سمجھایا۔

''عقل مندی ہے یہ عقل مندی۔ آج تک اگر کسی پرندے نے گھونسلے میں دانہ جمع نہیں کیا تو اس میں میری کیا غلطی ہے؟ میں تو ضرور جمع کروں گی۔'' چنّی چڑیا نے اٹل انداز میں کہا۔

''تم لالچ کر رہی ہو اور لالچ کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔'' چڑے نے کہا۔

''کوئی لالچ نہیں ہے تم بس خاموش رہو۔'' چنّی چڑیا کو غصہ آ گیا۔

دن گزرتے رہے، چڑے کے بار بار سمجھانے کے باوجود چتی چڑیا باز نہ آئی۔ اس کے گھونسلے میں دانوں کا اچھا خاصا انبار جمع ہو گیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ چڑا اپنے بچوں کے پاس تھا اور چتی چڑیا حسبِ معمول دانے تلاش کرنے نکلی ہوئی تھی۔ اچانک چڑے کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ آوازیں دو درخت چھوڑ کر تیسرے درخت پر ایک چڑیا کے گھونسلے سے آ رہی تھیں۔ چڑا اپنے بچوں کو گھونسلے میں آرام سے بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے فوراً اُس گھونسلے تک پہنچا۔

''کیا ہوا؟ چڑیا بہن'' چڑے نے گھونسلے میں بیٹھی چڑیا سے پوچھا جو سر جھکائے کراہ رہی تھی اور اس کے بچے اس کے ساتھ چپک کر شور مچا رہے تھے۔ اس چڑیا کا چڑا کچھ دنوں پہلے ایک چیل کا شکار بن چکا تھا اور اب یہ چڑیا اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کے گھونسلے میں دو چھوٹے بچے تھے جنھیں اب وہ خود ہی پال رہی تھی۔

''کیا بتاؤں چڑے بھیا، کل دوپہر سے میری طبیعت بہت خراب ہے، اُڑنے کی ہمت بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ میرے بچے کل شام سے بھوکے ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے لیے دانہ لینے گئی تو اُڑ نہ سکی اور نیچے گر گئی۔ میری ٹانگ پر چوٹ لگ گئی ہے، ایک اس کی تکلیف ہے اور دوسرے بھوک سے بلکتے بچوں کو دیکھ کر ہونے والی تکلیف ہے۔'' چڑیا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

''پریشان نہ ہو چڑیا بہن میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔'' چڑا واپس اپنے گھونسلے میں آیا تو وہاں جمع شدہ دانوں میں سے چونچ بھر کر دانے اُٹھانے ہی لگا تھا کہ سامنے سے چتی چڑیا آ گئی۔ اس نے اُسے ساری بات بتائی۔

''اب میں کچھ دانے چڑیا بہن کے گھر پہنچا کر آتا ہوں۔'' چڑے نے اپنی چونچ دانوں سے بھر لی۔

''کیوں؟ رکھو یہ دانے اِدھر، میں نے اتنی محنت سے جمع کیے ہیں۔'' وہ غصے میں آ گئی۔

''کیا ہو جائے گا اگر چند دانے چڑیا بہن کے بچے کھا لیں گے تو؟'' چڑے نے حیرت سے کہا۔

''یہاں سے تو میں ایک دانہ نہیں لینے دوں گی۔'' چتی کی ہٹ دھرمی قائم تھی۔

''یہ رکھو، اپنے دانے'' چڑے نے دانے واپس ڈھیر پر رکھے اور پھدک کر گھونسلے سے باہر آ گیا۔

''اب یہیں بیٹھ کر بچوں کا دھیان رکھنا میں چڑیا بہن کے لیے کچھ کرتا ہوں۔'' چڑا پُھر سے اُڑ گیا اور چتی چڑیا بڑبڑاتی رہی۔

چار پانچ دن تک چڑا، چڑیا اور اس کے بچوں کی مدد کرتا رہا یہاں تک کہ چڑیا بالکل تندرست ہو گئی۔ اب وہ اپنے بچوں کا خیال خود رکھتی تھی۔ چڑا البتہ گاہے بگاہے ان کی خیر خبر معلوم کرتا رہتا تھا۔ چتی چڑیا بس دانے جمع کرنے کے جنون میں مبتلا تھی۔

برسات کا موسم آن پہنچا۔ ایک دن مغرب سے کالے کالے بادل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف چھا گئے۔ ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ بارش کے ساتھ تیز ہوا چلنے لگی۔ چڑیا اور چڑے کے گھونسلے میں جمع شدہ دانوں کا انبار بھیگ کر وزنی ہو گیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ان دانوں کے بوجھ کی وجہ سے ہمارا گھونسلا بس گرنے ہی والا ہے۔'' چڑے نے پریشانی سے کہا۔ صورتِ حال دیکھ کر چتی چڑیا بھی پریشان ہو گئی۔

''چلو، جلدی کرو ان دانوں کو گھونسلے سے باہر پھینکو۔'' دونوں مل کر چونچیں بھر بھر کر دانے باہر پھینکنے لگے۔ اچانک ہوا کا ایک زوردار جھکڑ آیا اور ان کے گھونسلے کو بچوں سمیت اُڑا کر لے گیا اور پھر زمین پر گرا دیا۔ چڑیا اور چڑے کی جان نکل گئی۔ بھیگے ہوئے پروں سے اُڑنا بھی ناممکن ہو رہا تھا۔ دونوں جیسے تیسے گھونسلے کے پاس پہنچے۔ شکر کیا کہ بچے محفوظ تھے۔ بس سہم کر رو رہے تھے۔ چڑیا اور چڑے نے فوراً ان کو اپنے پروں میں چھپایا۔

''دیکھ لیا اپنی لالچ کا انجام، نہ تم دانوں کا ڈھیر جمع کرتی نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ اس دن تم نے چار دانے چڑیا بہن کو نہیں دینے دیے تھے اور آج وہی دانے ہمارے بچوں کی تکلیف کا سبب بن گئے۔'' چڑے نے کہا تو چتی چڑیا نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ واقعی یہ اس کے لالچ کی سزا تھی۔

''میں توبہ کرتی ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔'' چتی چڑیا نے کہا۔

چڑیا بہن نے بارش کا جائزہ لینے کے لیے گھونسلے سے ذرا سا سر باہر نکالا تو سامنے کا منظر دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ چڑا اور چتی چڑیا اپنے بچوں کو پروں تلے چھپائے زمین پر بیٹھے تھے اور بارش میں بھیگ رہے تھے۔ پاس ہی ان کا ٹوٹا پھوٹا گھونسلا بکھرا ہوا تھا۔

''آپ لوگ جلدی سے بچوں کو اُٹھائیں اور میرے گھونسلے میں آ جائیں، بارش بہت تیز ہے، کہیں بچے بیمار نہ ہو جائیں۔'' چڑیا بہن بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے ان کے ایک بچے کو اُٹھایا، دوسرے کو چڑے نے اور تیسرے کو چڑیا نے، تینوں بچوں کو چڑیا بہن کے گھونسلے میں ڈال اب وہ تینوں گھونسلے کے پاس درخت کے گھنے پتوں میں چھپ کر بیٹھے تھے۔

''چڑیا بہن مجھے معاف کر دینا میں نے لالچ میں اندھی ہو کر تمھاری مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' چتی چڑیا نے معافی مانگی۔

''کوئی بات نہیں۔ بس ہمیں مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔'' چڑیا بہن نے مسکرا کر کہا۔ تھوڑی دیر میں بارش رُک گئی۔ جتنے دن چڑیا اور چڑے نے اپنا گھونسلا بنانے میں لگائے، ان کے بچے چڑیا بہن کے گھونسلے میں آرام سے رہے۔ ان کا اپنا گھونسلا مکمل ہو گیا تو وہ اپنے بچوں کو واپس لے آئے۔ اس دن کے بعد سے چڑیا نے لالچ کیا اور نہ ہی کسی کی مدد کرنے سے انکار کیا، کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ یہ دونوں عادتیں بہت بُری ہیں۔ ☆

خرگوش کا بہترین دن

جاوید بسام

خزاں کے موسم میں بھالو، بھیڑیا اور لومڑ ہر وقت خرگوش کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اسے ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ ان ہی دنوں جنگل میں ایک شکاری گھومتا پھرتا آ نکلا۔ خرگوش نے فوراً اس سے دوستی کرلی۔ وہ اکثر شکاری کی مدد کرتا نظر آتا۔ پھر شکاری وہاں سے چلا گیا۔

ایک دن خرگوش مزے سے اپنی کھوہ میں سو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ باہر لکڑ بگھا کھڑا تھا۔ وہ ان دنوں جنگل میں ڈاکیا بنا ہوا تھا۔

''تمہارا پارسل آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''بھلا مجھے کس نے پارسل بھیجا ہے؟'' خرگوش نے حیرت سے پوچھا۔

لکڑ بگھے نے تھیلے سے پارسل نکالا اور غصے سے بولا۔

''بھیجنے والا وہی شکاری ہے۔ جس کی تم نے شکار میں مدد کی تھی۔''

خرگوش نے پارسل لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''جلدی سے یہاں دستخط کردو۔'' لکڑ بگھا بولا۔

خرگوش نے دستخط کیے اور پارسل لے کر اندر آیا۔ جب اس نے پارسل کھولا تو حیرت سے اچھل پڑا۔ اس میں بھالو کے فر کا کوٹ تھا۔ ایک پرچے پر شکاری نے لکھا تھا۔

''پیارے دوست خرگوش کے لیے تحفہ۔''

خرگوش نے کوٹ پہن کر دیکھا اور بولا:

''واہ کیا زبردست چیز ہے۔''

اچانک دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر لکڑ بگھا پھر موجود تھا۔

''تمہارا دوسرا پارسل بھی آیا ہے۔'' اس نے کہا۔

اور تھیلے سے پارسل نکال کر دیا۔

خرگوش نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے پارسل لیا۔ وہ بھی شکاری نے بھیجا تھا۔ اندر آ کر اس نے کھولا تو اس میں سے لومڑی کی دم کے بالوں والی ٹوپی نکلی۔ خرگوش خوشی سے جھوم اٹھا۔ ''واہ! مجھے حیرت انگیز تحفے مل رہے ہیں اور میرے دشمن بھی ختم ہو رہے ہیں۔'' اس نے سر پر ٹوپی جمائی اور آئینے میں دیکھنے لگا۔ اچانک پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ خرگوش نے حیرت سے گردن گھمائی اور دروازہ کھولا۔ لکڑ بگھا پھر موجود تھا۔

وہ بولا:

''تمہارا تیسرا پارسل بھی ہے۔''

''تیسرا پارسل'' خرگوش چلایا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ لکڑ بگھے نے اس کے ہاتھ میں پارسل دیا۔

''دیکھ لو، اور تو نہیں ہے؟'' خرگوش نے کہا۔

لکڑ بگھے نے گھور کر اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

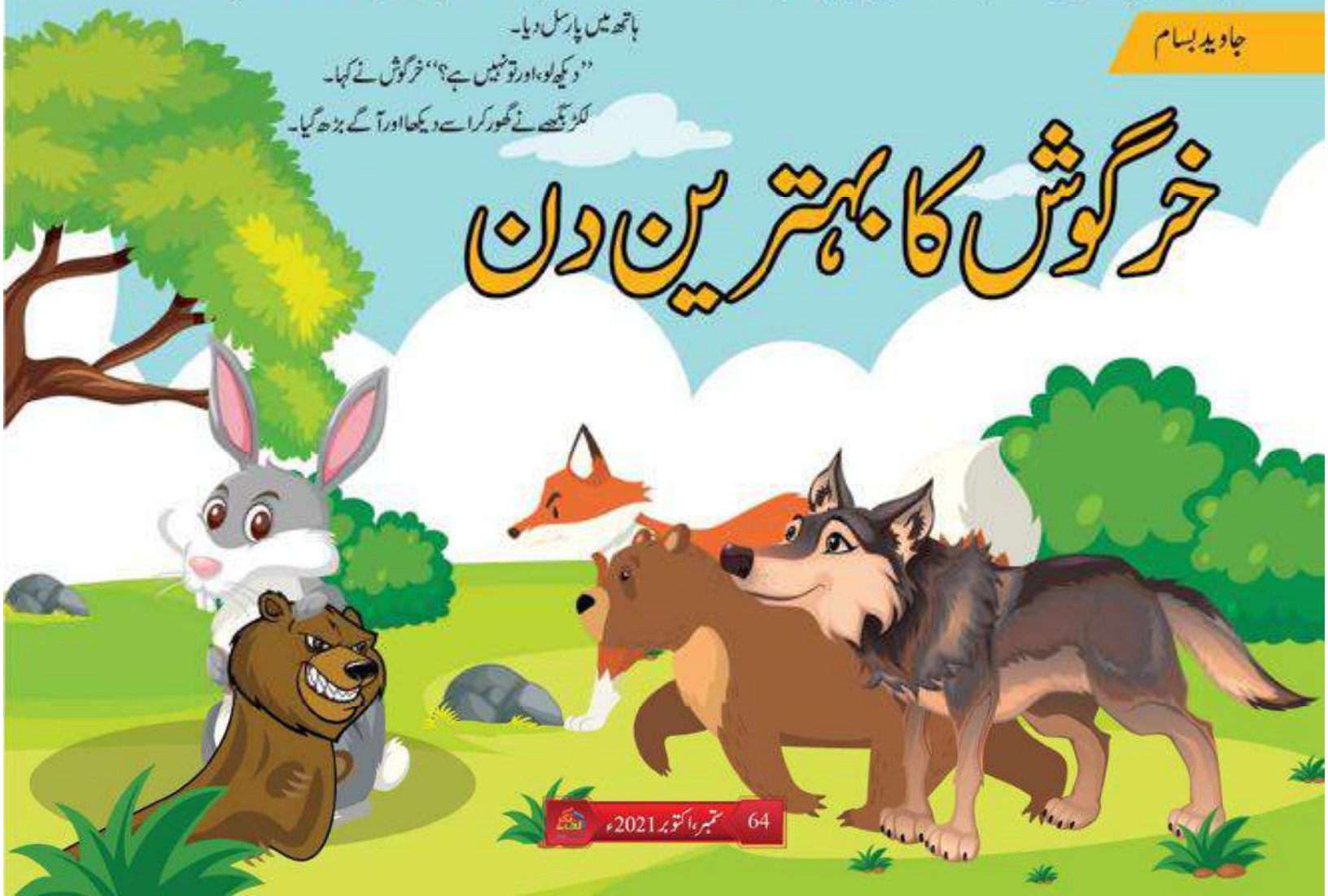

خرگوش اندر آیا اور پارسل کھولا اس میں بھیڑیے کی کھال کے کالے چمچماتے جوتے تھے۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا۔

''واہ! آج میری زندگی کا بہترین دن ہے۔ آخر میں نے اپنے دشمنوں پر فتح پالی۔''

کچھ دیر بعد وہ نئی سج دھج کے ساتھ باہر نکلا۔ بھالو کے فر کا کوٹ، لومڑ کی دم کی ٹوپی اور بھیڑیے کی کھال کے جوتے پہنے وہ اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔ سب جانور حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اچانک پیچھے سے بھالو کی خرخر آہٹ سنائی دی۔ خرگوش نے گردن گھما کر دیکھا۔ بھالو دھپ دھپ چلتا پیچھے آ رہا تھا۔ بغیر کھال کے وہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ خرگوش نے چیخ ماری اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ کچھ دور جانے کے بعد اچانک اسے بھیڑیے کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بھیڑیا زبان باہر لٹکائے بغیر کھال کے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ وہ بھی بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ خرگوش کی رفتار اور بڑھ گئی وہ دونوں اس کے پیچھے لگے تھے۔ کچھ دور جا کر اچانک خرگوش کو لومڑ کی چیخ سنائی دی۔ وہ بغیر دُم کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ خرگوش سرپٹ دوڑنے لگا۔ وہ جنگل کے اونچے نیچے راستوں، جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان دوڑا جا رہا تھا۔ ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر بھیڑیا اس کے قریب چلا آیا۔ پھر اس نے جست لگائی اور خرگوش کو پکڑ لیا۔ خرگوش نے خوفناک چیخ ماری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ اپنی کھوہ میں تھا اور آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور بولا:

''اب دشمن خواب میں بھی آ کر ڈرانے لگے ہیں، لگتا ہے مجھے انھیں سبق سکھانا پڑے گا۔''

کچھ دیر بعد خرگوش کھوہ سے باہر آیا اور ایک طرف چل دیا۔ بھالو، بھیڑیا اور لومڑ جھاڑیوں میں چھپے تھے۔ وہ بھی اس کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ آج خرگوش کو پکڑنے کا منصوبہ بنا کر آئے تھے۔ خرگوش نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ دشمن پیچھے آ رہے ہیں، مگر وہ انجان بنا رہا۔ وہ پہاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ جو درختوں میں گھری تھیں۔ وہاں لمبی گھاس اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ وہاں پہنچ کر خرگوش اوپر چڑھنے لگا۔ تینوں نظریں جمائے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ خرگوش ایک غار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر وہ اس میں داخل ہو گیا۔ تینوں نے خوشی سے ہاتھوں پر ہاتھ مارے اور دبے قدموں اس طرف بڑھے۔ خرگوش کو پکڑنے کا اس سے اچھا موقع کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ بھالو نے سرگوشی کی۔

''چلیں آج خرگوش ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔''

تینوں اندر داخل ہوئے۔ غار بہت گہرا تھا اور اس میں اندھیرا بھی تھا۔ وہ آگے بڑھے۔ لومڑ بولا:

''خرگوش کہاں ہے؟''

''مل جائے گا یوں ہی چلتے رہو۔'' بھیڑیا غرایا۔

ابھی وہ کچھ آگے بڑھے ہی تھے کہ غار کی دیواروں پر لاتعداد چمکتی آنکھیں نظر آئیں۔ پھر اچانک پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور کسی نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ انھیں کاٹ رہی تھیں۔

''ارے! یہ کیا ہیں؟'' بھالو چلایا۔

وہ بڑی بڑی خوفناک چمگادڑیں تھیں جو اپنے مسکن میں آرام کر رہی تھیں۔ انھیں جانوروں کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ تینوں چیختے چلاتے بھاگے اور گرتے پڑتے غار سے باہر نکلے۔ پھر بھاگتے ہوئے دور نکل گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خرگوش کہاں گیا اور ان پر چمگادڑوں نے حملہ کیوں نہیں کیا؟ دراصل وہ نہیں جانتے تھے کہ خرگوش غار میں داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ غار کے دہانے کے قریب لمبی گھاس میں چھپ کر رینگتا ہوا دور نکل گیا تھا اور اب ٹیلے پر بیٹھا انھیں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ☆

سپر ہیرو

''جی دادا جان! یہ تو سپر ہیروز جیسے ہیں۔'' ماحد نے حیرانی سے کہا تو اظہر کیانی مسکرا دیے۔

''بچو! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ اپنی مٹی، زمین، ملک کے لیے لڑنے والا ایک عام سپاہی، ایک عام فوجی بھی سپر ہیروز والی طاقت اور مقام رکھتا ہے کیونکہ وہ شہادت اور قربانی کے جذبے سے مالا مال ہوتا ہے۔ ہماری روشن تاریخ میں بہت سے نام، اپنی بہادری اور جرات کی وجہ سے روشن ہوئے اور بہت سے نام گمنامی میں رہ کر ملک کی خدمت کرتے رہے۔ آپ سب کو بھی ان جیسا بننا ہے۔ اپنے وطن، اپنی زمین سے محبت کرنے والا۔ جب آپ سچے دل سے اپنے وطن سے محبت کریں گے تو آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کے اندر انوکھی اور آسمانی طاقتیں پیدا ہو گئیں ہیں۔''

اظہر کیانی نے نرمی سے سمجھایا تو سب بچوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سب کافی دیر تک پاکستان کی تینوں افواج کے بارے میں مختلف رپورٹس، ویڈیوز، ڈاکومنٹری پروگرام دیکھتے رہے۔ رات کو جب وہ سب وہاں سے رخصت ہوئے تو بچوں کی سوچ میں ایک واضح تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ اظہر کیانی کو ماحد سے ہونے والی اگلی ملاقات میں ہوا۔ جب اس نے خوشی خوشی بتایا کہ وہ بڑا ہو کر ائیر فورس میں جائے گا۔ اظہر کیانی مسکرا دیے۔ وہ جانتے تھے کہ اس ملک کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ بس اسے مناسب ہوا اور توجہ کے پانی کی ضرورت ہے جس کا حق وہ اپنی زندگی میں ادا کرتے رہیں گے۔ اپنی نسل کو حب الوطنی کی راہ دیکھا کر.....

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے۔

سو میں رہوں نہ رہوں، اس کو بارور کر دے۔ ☆

سائنس فکشن

انوکھی بھوک ہڑتال

حنا نرجس

سوشل میڈیا پر عام ہوئی خبر اب تمام بڑے اخبارات تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ جو بھی سنتا مارے حیرت کے انگلیاں دانتوں میں داب لیتا۔ نہم جماعت کا طالب علم فواد پندرہ دن سے کچھ بھی کھائے بغیر صرف پانی پی کر زندہ تھا۔ نہ صرف زندہ تھا، ہر طرح سے سرگرم اور چست و توانا تھا۔

اس سارے عرصے میں وہ روزانہ صبح اسکول اور شام کو اکیڈمی جاتا رہا۔ قریبی کھیل کے میدان میں کرکٹ کھیلتا۔ امی کو سودا سلف لا کر دیتا۔ رات کو دادا ابو کو چہل قدمی کے لیے لے کر جاتا۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی کمزوری و نقاہت کے نشانات ڈھونڈے سے بھی نظر نہ آتے تھے۔

اسے بھوکے پیاسے جب دس دن ہو چلے تو اس کے ابو قریبی کلینک پر لے کر گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو بڑے ہسپتال بھیج دیا۔ وہاں اس کیس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ایم ایس صاحب نے اسے ہسپتال میں داخل کرنے کے احکامات دے دیے اور سینئر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم تشکیل دے دی تا کہ معلوم ہوا کہ وہ چھپ چھپ کر کچھ کھاتا تو نہیں اور پھر بھوک نہ لگنے کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہیں سے ایک ڈاکٹر نے مختصر سی ویڈیو بنا کر اپ لوڈ کر دی جس میں بتایا گیا تھا کہ لڑکے کے سارے ٹیسٹوں کا نتیجہ ٹھیک آیا ہے۔ ہر وقت خوش باش اور کھیل کود میں مگن رہتا ہے۔ کچھ بھی کھانے کو دو تو کہتا ہے، ذرا بھی گنجائش نہیں، بس پیاس لگی ہے تھوڑا سا پانی پیوں گا۔ اس کی امی کہتی ہیں کہ میرے پاس آخری کھانا اس نے آج سے پندرہ دن قبل اسکول جانے سے پہلے پراٹھا انڈا کھایا تھا۔

.....☆.....

ادھر جینئس کلب کے منتظمین میں شدید بے چینی پائی جاتی تھی۔ انہیں فواد کے بارے میں علم سوشل میڈیا اور اخبارات سے ہوا تھا۔ کلب کے سب ممبران سے رازداری برتنے کا پختہ عہد لیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا؟ فیصلہ کیا گیا کہ جلد ہی تمام ممبران کا اجلاس بلایا جائے گا اور اس معاملے میں کسی سے کوئی نرمی نہ برتی جائے گی۔

سر ذیشان کی بھوک بھی آج کل اُڑی ہوئی تھی وہ بس چند نوالے زبردستی حلق سے نیچے اتارتے۔ ایک مسلسل خوف انہیں اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ غلطی ان سے ہوئی تھی لیکن مارے شرمندگی کے وہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

انہیں ہر وقت ڈر لگا رہتا کہ پتہ نہیں کب انتظامیہ کی انگلیاں ان کی جانب اٹھ جائیں اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر انہیں ہمیشہ کے لیے بلیک لسٹ کر دیا جائے۔

سائنسی تحقیق ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے بھلا جینئس کلب سے بہتر کون سا پلیٹ فارم ہو سکتا تھا۔

☆

انتیس ممبران کی نگاہیں سرذیشان پر مرکوز تھیں۔ آخر انہوں نے اجلاس میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا: ''مم مجھ سے غلط..... غلطی ہوئی ہے۔''

ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

''اس دن میں آم گھر سے کھا کر جانا بھول گیا تھا، اس لیے ساتھ لے گیا۔ سارا دن اسکول میں مصروف رہا۔ چھٹی کے وقت اسٹاف روم خالی تھا۔ میں نے سوچا اسکول سے نکلنے سے قبل ہی کھا لیتا ہوں۔ میں نے آم نکال کر میز پر رکھا اور ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو آم غائب تھا۔''

''ثابت تو یہ ہی ہوتا ہے کہ لڑکے نے آم چرایا ہے، لیکن آیا اس کے پیچھے کوئی سازشی ہاتھ ہے یا محض اس کا ذاتی عمل، اس کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی جائے گی ہم لڑکے کے بائیو ڈیٹا کی مدد سے پہلے ہی اپنے ان تین ممبران کو بلیک لسٹ کر چکے تھے جو رائل سائنس اسکول کے اساتذہ ہیں۔'' منتظم کا لہجہ خشک تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا:

''بہر حال آپ ہمارے دیرینہ ساتھی ہیں۔ ہم آپ کو بلیک لسٹ تو نہیں کر رہے لیکن کچھ نہ کچھ سزا آپ کو ضرور دی جائے گی۔''

سرذیشان کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ بلیک لسٹ ہونے سے بچ گئے تھے۔

☆

فواد کو تو شاید یاد تک نہیں تھا کہ اس نے اس دن اسکول کی چھٹی کے وقت نکلتے نکلتے یوں ہی سٹاف روم میں جھانکا، تو اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میز پر ایک موٹا تازہ آم دیکھ کر اس کا جی للچایا، اس نے اٹھا کر بستے میں رکھ لیا اور اکیڈمی پہنچ کر مزے لے لے کر کھایا۔ ہاں ایک بات اسے بہت عجیب لگی۔ اس آم میں کوئی گٹھلی نہیں تھی۔

یہ عام آم نہیں تھے بلکہ آم کے چھلکے میں بند کیے گئے توانائی یونٹس تھے۔ جینئس کلب کے رکن ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان ایک تحقیق کر رہے تھے۔ ہر یونٹ کے پھٹنے اور توانائی خارج کرنے کا ایک وقت مقرر تھا۔ جب وہ پھٹتا، کھانے والے کو پیاس محسوس ہوتی لیکن پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے کھانے کو بالکل دل نہ چاہتا۔ ایک یونٹ کی توانائی اگلے یونٹ کے پھٹنے تک کام آتی رہتی۔

یہ آم عام دستیاب غذائی اجزا کو ایک خاص طریقہ کار سے گزار کر گاڑھا کر کے بنائے گئے تھے۔ اس طرح ان میں موجود توانائی کئی گنا زیادہ موثر ہو جاتی تھی۔ ان کا مقصد بڑھتی ہوئی آبادی اور مہنگائی کے پس منظر میں خوراک کی ضروریات پوری کرنا تھا۔ ان پر کچھ زیادہ لاگت نہیں آئی تھی لہٰذا کم قیمت پر عوام کو مہیا کیے جا سکتے تھے۔

ویسے قیمت کا انحصار پیک کیے گئے توانائی یونٹس کی مدت پر تھا جو ہفتوں سے لے کر مہینوں تک ہو سکتی تھی۔ ابتدائی طور پر تیس آم بنائے گئے تھے جو ممبران نے کھانے تھے۔ ان کی توانائی ایک ماہ تک کے لیے کافی تھی۔ ممبران کو یہ تجربہ صیغہ راز میں رکھنے کو کہا گیا تھا۔ ہاں، ناگزیر حالات میں گھر کے صرف ان قابلِ اعتماد افراد کو بتانے کی اجازت تھی جو راز رکھ سکتے تھے کیونکہ کھانا نہ کھانے کا معاملہ قریبی افراد سے چھپانا تقریباً ناممکن تھا۔ اب اپنے اس خفیہ تجربہ کو ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھتا دیکھنا واقعی پریشانی کی بات تھی۔

☆

ڈاکٹرز سر توڑ کوشش کے باوجود بھی سراغ لگانے میں ناکام رہے۔ وہ لوگوں کی ان آرا کو غلط ثابت کرنا چاہتے تھے جن کے مطابق یہ کسی جن بھوت یا ماورائی مخلوق کی کارستانی تھی، لیکن جب اس معاملے کا کوئی سرا ہاتھ نہ آ سکا، تو انہوں نے فواد کو ہسپتال سے چھٹی دے دی۔ اس دن فواد کو کھانا نہ کھاتے ہوئے اکیس دن ہو گئے تھے۔

لوگوں نے یہ سوچ کر حیران ہونا چھوڑ دیا کہ معجزے اسی دنیا میں ہوتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ ایک ماہ مکمل ہوا تو فواد کو پھر سے بھوک لگنے لگی۔ سب نے شکر ادا کیا کہ لڑکا ماورائی مخلوقات کے چنگل سے نکل آیا ہے۔

ادھر تجربے کی مدت پوری ہو چکی، تو میڈیا پر ایک بار پھر ایک بڑی خبر کی دھوم تھی۔ جینئس کلب کے منتظم اعلیٰ نے پریس کانفرنس میں کامیاب تجربے کے بارے میں سب کو آگاہ کر کے گویا کوئی دھماکہ ہی تو کر دیا تھا۔ فواد کا راز بھی سب پر عیاں ہو گیا۔

عوام کا ردعمل ملا جلا تھا۔ ملازمت پیشہ خواتین، پروفیسرز، قلمکار، ڈائٹنگ کرنے والے، زیادہ سونے کے شوقین، اکثر سفر میں رہنے والے اور مشکل و پرخطر مہمات پر جانے والے بہت خوش تھے۔ انہوں نے اس تجربے کو بہت سراہا اور جلد از جلد عام لوگوں کے لیے ان آموں کی دستیابی کا مطالبہ کیا جبکہ کسانوں، تاجروں، صنعت کاروں، ہوٹلوں اور ریستورانوں کے مالکان، دودھ، انڈے، سبزی، پھل، گوشت، خشک میووں کے کاروبار سے وابستہ افراد نے سخت احتجاج کیا کہ اگر لوگوں کو بھوک نہیں لگے گی، تو ہمارا کاروبار کیسے چلے گا۔ ہم ان آموں کو کسی صورت مارکیٹ میں نہیں آنے دیں گے۔

بالآخر حکومت نے فریقین سے مذاکرات کر کے درمیانی راہ نکالی اور محدود پیمانے پر ان آموں کی تیاری کی اجازت دے دی۔ ☆

بانو اور بونے

بنت محمد صدیق

بانو ایک پیاری اور گول مٹول سی بچی تھی جو کہ ایک سرسبز و شاداب گاؤں میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بانو کے بھائی سارا دن کھیل کود میں گزار دیتے تھے جبکہ بانو گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ آج بھی بانو اناج صاف کرنے میں امی کی مدد کر رہی تھی کہ اچانک امی کو کچھ یاد آیا اور وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں:

''مجھے ابھی ترکاری بھی پکانی ہے تمہارے ابو کھیتوں سے کام کر کے واپس لوٹنے والے ہیں۔ ذرا اٹھ کر دیکھو مٹکے میں کچھ پانی ہے؟''

بانو صحن میں ایک طرف رکھے مٹکے کی طرف گئی۔ اس میں جھانکا تو وہ سوکھا پڑا تھا۔ بانو نے امی کو بتایا۔ امی نے کہا:

''کمرے میں پیالے کے اندر کچھ پانی رکھا ہے جو کہ ہم سب کے لیے ناکافی ہے۔ کیا تم برگد والے کنویں سے پانی لانے میں میری مدد کر سکتی ہو؟''

بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ میری پیاری بیٹی! مجھے پتا تھا کہ تم ضرور میری مدد کرو گی۔ وہ رہا ڈول، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کیا تم برگد والے کنویں کا راستہ جانتی ہو؟ تم میرے ساتھ اکثر وہاں جاتی رہی ہو۔'' امی نے اسے یاد دہانی کرائی۔

بانو نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دوبارہ سر ہلایا اور ڈول پکڑ کر بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔ بانو ڈول گھماتے ہوئے پگڈنڈی کی طرف جانے لگی۔ باہر ایک طرف نرم گھاس پر بلی کے سفید اور کالی رنگت والے چار بچے پیالے میں سے دودھ پی رہے تھے۔ بانو کو ڈول ہلاتے ہوئے بھاگتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر پیالے سے دور چلے گئے۔ بانو ہنسی اور انہیں پچکارتے ہوئے بولی:

''بلی کے پیارے پیارے بچو! میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گی میں تو بس یہاں سے گزر رہی تھی۔ شاباش آؤ تم پیالے میں سے دودھ پی لو میں تو برگد والے کنویں کی طرف جا رہی ہوں۔'' بانو نے بلی کے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور ڈول گھماتے ہوئے پگڈنڈی پر چڑھ گئی۔ سامنے سے ہرن کا ایک بچہ آتا دکھائی دیا۔ بانو کو بھاگتے دیکھا تو ڈر کر ڈھلوان میں اتر گیا اور چوکڑیاں بھرتا ہوا جھاڑی میں جا چھپا۔

''ہرن کے بچے! میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میں تو برگد والے کنویں پر جا رہی ہوں۔'' بانو نے جھاڑی کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے کہا۔ بانو کی بات سن کر ہرن کے بچے نے جھاڑی میں سے سر نکالا اور بانو کو جاتا دیکھ کر دوبارہ پگڈنڈی کی طرف آ گیا۔ بانو ڈول گھماتے ہوئے پگڈنڈی پر بھاگتی ہوئی کنویں کی طرف جا رہی تھی۔ دور ہی سے اسے کنواں دکھائی دیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ کنویں کی منڈیر پر بہت سی چڑیاں بیٹھی

ہوئی تھیں۔ بانو کنویں کے قریب پہنچی تو چڑیاں بانو کو دیکھ کر پھر سے اڑ گئیں۔ بانو نے حیرت سے چڑیوں کو دیکھا اور ان کے پیچھے بھاگی۔

''ارے! تم کیوں اڑ گئیں میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچانے نہیں آئی۔ میں تو بس کنویں سے پانی لینے آئی ہوں۔''

چڑیاں برگد کے پیڑ کی شاخوں پر بیٹھ کر بانو کو دیکھنے لگیں۔ بانو نے ڈول رسی سے باندھ کر کنویں میں ڈالا۔ ڈول پانی سے بھر گیا جوں ہی اس نے پانی سے بھرا ڈول کھینچا ڈول کے ساتھ بندھی رسی کھل گئی اور ڈول واپس کنویں میں جا گرا۔

''اوہ! میرا ڈول بانو نے پریشانی سے کنویں میں جھانکا، ڈول پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔ ''میں اب کیا کروں؟'' اگر میں پانی کے بغیر گھر گئی تو امی خفا ہوں گی اور میں ڈول بھی نہیں کھونا چاہتی۔ میں کیسے اپنا ڈول کنویں سے نکالوں۔ کنویں میں تو پانی بہت نیچے ہے میں کیا کروں؟''

بانو کچھ دیر کنویں میں جھانکتی رہی۔ جب کچھ سمجھ نہیں آیا تو کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر رونے لگی۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی تیز ہوا سے برگد کے پیڑ کی شاخیں جھول رہی تھیں۔ بانو نے اردگرد مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر بانو کو ایک خیال آیا اس نے کنویں میں اترنے کا فیصلہ کیا۔

بانو نے کنویں میں اترنے سے پہلے منڈیر پر بیٹھ کر کنویں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کنویں کے اندر کچھ کچھ فاصلے پر دیوار سے اینٹیں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں جو کہ نیچے تک جا رہی تھیں ان کی مدد سے کنویں میں اترا جا سکتا تھا۔ بانو نے پہلی اینٹ پر پاؤں رکھا اور کنویں میں اتر گئی۔ چار پانچ اینٹوں پر پاؤں اور ہاتھوں کی مدد سے اترنے کے بعد جوں ہی اس نے ایک اینٹ پر پاؤں رکھا تو وہ اسے ہلتی ہوئی محسوس ہوئی پھر ایک دم وہ اینٹ اکھڑ کر کنویں میں جا گری۔

بانو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کنویں میں گر گئی۔ کنویں میں گرتے ہی بانو چیخنے لگی اور ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ بانو کا ہاتھ لکڑی کی ایک چیز سے ٹکرایا۔ بانو نے غور سے دیکھا تو وہ ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس میں تین بونے سوار تھے۔ پانی کی حرکت کے باعث کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ بونے ڈر کے مارے کشتی کی سطح سے چپکے ہوئے تھے۔ بانو نے کشتی کو ہاتھ میں پکڑا اور حیران ہو کر بونوں کی طرف دیکھنے لگی جو کہ بانو پر نظر پڑتے ہی خوف سے چلانے لگے تھے۔ ایک دم پانی کے اُچھال سے کشتی الٹنے لگی تو دو بونے اچھل کر پانی میں جا گرے۔ بانو نے کشتی کو سیدھا کیا اور بونوں کو پکڑ کر کشتی میں بٹھایا۔ بونے کشتی میں بیٹھتے ہی پرسکون ہو گئے لیکن جوں ہی بانو پر نظر پڑی تو دوبارہ چیخنے لگے، وہ بانو سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اتنا بڑا انسان پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بانو نے انہیں پیار سے دیکھتے ہوئے کہا:

''ڈرو نہیں میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔''

لیکن بونے چیختے رہے۔ اس دوران پانی کی حرکت سے کشتی دوبارہ الٹنے لگی تو بانو نے بونوں کو کشتی سمیت ہاتھ میں پکڑ لیا اور بونوں کو گرنے سے بچانے کے لیے ہاتھ کی مٹھی کو آدھا بند کر کے اس کے اوپر دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ اب بونے گرنے سے محفوظ ہو گئے تھے۔ بانو خود پانی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے پاؤں کنویں کی نچلی سطح سے ٹکرائے اس نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا۔ بانو نے ہاتھ کو تھوڑا سا اٹھا کر دیکھا تو ایک بونے نے ایک سمت میں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بانو نے اس سمت دیکھا تو وہاں کنویں کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ بانو سمجھ گئی کہ بونے وہاں جانا چاہتے ہیں۔ بانو نے بونوں کو دروازے کے قریب کیا۔ ایک بونے نے دروازے کے پاس جا کر کچھ کہا تو دروازہ فوراً کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی بانو نے دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹی سی نہر تھی جو ایک میدان میں سے ہوتی ہوئی ایک قلعہ نما عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔ بانو نے بونوں کی کشتی کو اس نہر میں رکھ دیا۔ کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ بانو بونوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگی۔ بونوں نے بانو کو بھی دروازے سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ بانو بڑی مشکل سے اس دروازے سے گھس کر اندر داخل ہوئی اور بونوں کی کشتی کے ساتھ ساتھ نہر میں چلنے لگی۔ میدان میں اپنے کاموں میں مصروف بونے بانو پر نظر پڑتے ہی قلعے کی طرف بھاگے۔

قلعے کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بونوں کی ایک فوج تیر کمان لیے قلعے سے برآمد ہوئی لیکن کشتی میں سوار بونوں کو دیکھ کر رک گئی۔ بونے کشتی ایک طرف کنارے پر لے گئے اور بانو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ بانو ان کے ساتھ چلتے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ایک خوبصورت سا محل تھا جس کے داخلی دروازے پر خوبصورت لباس پہنے ایک بونا کھڑا تھا جو کہ باقی بونوں سے کچھ بڑا لگ رہا تھا۔

یہ بونوں کا سردار تھا اس کے اردگرد بونوں کی فوج تھی۔ وہ تینوں بونے سردار کے پاس گئے سردار نے انہیں پیار کیا۔ وہ سردار کے بیٹے تھے جو کہ سیر و تفریح کے لیے آج بستی سے باہر نکل گئے تھے۔ بونے سردار کو بتا رہے تھے کہ کس طرح بانو نے آج ان کی جان بچائی۔ سردار یہ سن کر بہت خوش ہوا اس نے بانو کا شکریہ ادا کیا۔ سردار ان بونوں اور بانو کو محل کے اندر لے گیا۔ محل جتنا باہر سے خوبصورت تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اندر سے دلکش تھا بانو کو بیٹھنے کے لیے جو کرسی پیش کی گئی وہ بہت چھوٹی تھی بانو اس پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے وہ مخملیں فرش پر بیٹھ گئی۔ سردار کے بیٹوں کی جان بچ جانے کی خوشی میں محل میں شادیانے بجائے جا رہے تھے اور جشن کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ بانو کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا وہ مٹھائیوں کے تھال سر پر اٹھائے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے بونوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ بانو بونوں کی بستی میں آ کر بہت خوش تھی۔ بونوں کا سردار تخت کی جانب

بڑھا اور تخت پر بیٹھتے ہی اس نے بانو سے کہا:

''خوش آمدید اچھی لڑکی! تم نے میرے بیٹوں کی جان بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کے بدلے میں تمہیں انعام سے نوازا جائے گا لیکن کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم کنویں میں کیسے پہنچی تھی؟'' بانو نے سردار کو بتایا کہ اس کا ڈول کنویں میں گر گیا تھا جسے نکالنے کے لیے وہ کنویں میں اتر رہی تھی کہ کنویں میں گر گئی۔ ڈول کا خیال آتے ہی بانو افسردہ ہو گئی اس نے سردار کو بتایا کہ: ''اگر وہ ڈول کے بغیر گھر گئی تو اس کی امی ناراض ہوں گی۔ آپ انعام میں مجھے میرا ڈول دلا دیں۔ میں اپنا ڈول کھونا نہیں چاہتی۔'' بانو نے سردار سے کہا اور رونے لگی۔

''تم ایک بہادر لڑکی ہو تم نے خود مشکل میں ہوتے ہوئے بھی میرے بیٹوں کی جان بچائی۔ میں ابھی تمہارا ڈول ڈھونڈنے کے لیے سپاہیوں کو بھیجتا ہوں۔'' سردار نے سپاہیوں کی ایک فوج روانہ کی جو کچھ دیر کے بعد محل کے اندر ایک قطار کی صورت میں داخل ہوئی۔ بانو کا ڈول انہوں نے اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ بانو اپنا ڈول دیکھ کر چہک اٹھی۔

''آہا! میرا ڈول مل گیا۔'' عین اس وقت کنویں کی نچلی سطح میں کوئی چیز زور سے گرنے کی آواز آئی۔ بونوں کی بستی لرز کر رہ گئی ہر کوئی پریشان ہو گیا۔ سردار نے اپنے تجربہ کار سپاہیوں کو بستی کے داخلی دروازے پر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے آ کر بتایا کہ کنویں کے پیندے میں درخت کا ایک مضبوط تنا گرایا گیا ہے جو کہ پانی میں سے ہوتا ہوا کنویں میں بہت اوپر تک جا رہا ہے۔ سپاہی کی بات سن کر بانو فوراً بول اٹھی:

''معزز سردار! ہمارے گاؤں میں جب کوئی کنویں میں گر جاتا، تو اسے بچانے کے لیے درخت کا لمبا سا تنا کنویں کے اندر گرایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی مدد سے باہر آ جائے۔ یقیناً میری ماں نے میرے پیروں کے نشان کنویں کی منڈیر پر دیکھ لیے ہوں گے۔ اسی لیے انہوں نے یہ تنا کنویں میں گرایا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے میں اپنی ماں کے پاس جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے اچھی لڑکی! تمہیں جانا چاہیے لیکن اوپر پہنچ کر تم رسی ضرور کنویں میں پھینکنا تاکہ تمہارا ڈول رسی کے ساتھ باندھا جا سکے۔''

بانو نے اثبات میں سر ہلایا اور انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے قلعے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ بانو تنے پر چڑھتی گئی کچھ ہی دیر بعد وہ کنویں سے باہر پہنچ چکی تھی۔ اس نے دیکھا اس کی ماں کنویں کی منڈیر پر بیٹھی اسے آوازیں دے رہی تھی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی بانو پر نظر پڑتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھی ''اوہ! میری بیٹی۔'' کہتے ہوئے انہوں نے بانو کو گلے سے لگا لیا۔ بانو نے ماں سے علیحدہ ہو کر فوراً رسی کا سرا کنویں میں پھینک دیا۔ بانو کی ماں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب رسی ساکن ہو گئی تو بانو نے رسی کھینچنا شروع کر دی۔ اسے رسی وزنی محسوس ہوئی اس نے ماں کو مدد کے لیے پکارا۔ دونوں ماں بیٹی نے مل کر رسی کو کھینچا۔ جب ڈول باہر آیا تو دونوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ڈول ہیروں اور قیمتی جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ بانو کی ماں اتنے زیادہ ہیرے دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھی اور بولی:

''یہ کیا ماجرا ہے بانو، کیا کنویں میں کوئی خزانہ نکل آیا ہے؟''

''نہیں امی،'' بانو ہنس دی۔

''کنویں میں سے کوئی خزانہ نہیں نکلا۔ یہ تو انعام ہے جو بونوں کی جان بچانے پر ان کے سردار نے مجھے دیا ہے۔'' بانو نے ماں کو سارا واقعہ سنایا جسے سن کر بانو کی امی خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ اتنے میں بانو کا باپ بھی ان دونوں کو ڈھونڈتا ہوا کنویں پر آ گیا۔ سب کچھ جان کر وہ بھی بہت خوش ہوا۔ شام ڈھل رہی تھی بانو نے اپنے ماں باپ کے ہمراہ گھر واپس جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ ☆

بقیہ: قائداعظمؒ محمد علی جناح

متحد ہو چکے ہیں اور اب وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی گندی سیاست سے نہیں ڈریں گے۔

ہندو لیڈر چاہتے تھے کہ انگریز جب ہندوستان چھوڑ کر جائیں تو حکومت ان کے ہاتھ میں آ جائے اور مسلمانوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے مگر قائداعظم نے بتایا: ''مسلمان ہندوؤں سے ایک الگ قوم ہیں۔ حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کو ہندو اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو مسلم اکثریت کے علاقے دے۔ اب اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔''

جیسے ہی قیام پاکستان کا اعلان ہوا ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ لٹے پٹے مسلمان پاکستان کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ ان کی آبادکاری اور خوراک ایک مسئلہ تھی۔ قائداعظم نے سرحد پر جا کر ان کے انتظامات کی خود نگرانی کی۔

آخر کار قائداعظم کی ان تھک کوششوں اور مسلمانوں کی الگ ملک کے حصول کے لیے قربانیوں کی وجہ سے 14 اگست 1947ء بروز جمعہ 27 رمضان المبارک کو پاکستان بن گیا۔ 15 اگست 1947ء کو جسٹس عبدالرشید نے قائداعظمؒ سے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف لیا۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے آپ نے صرف ایک روپیہ تنخواہ لی۔

پاکستان بن جانے کے بعد سے لے کر اپنی وفات تک ایک سال کے عرصے کے دوران قائداعظمؒ نے تعلیم، تجارت، آئین سازی، معاشی اور سرحدی امور کی طرف بھرپور توجہ دی۔

11 ستمبر 1948ء کی رات ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور قائداعظم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ☆

قارئین کے کٹھے بیٹھے اور دل چسپ خطوط والا منفرد سلسلہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الف نگر کا جولائی، اگست کا خوبصورت اور رنگین شمارہ حسب روایت کہانی کی اشاعت پہ اعزازی طور پر ملا تو بہت خوشی ہوئی۔ الف نگر کو دیکھ کر احساس ہوا کہ اسے سجانے، سنوارنے والے میگزین کہ بہتری کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔

کہانیوں اور نظموں کا انتخاب ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ کہانیوں کے انتخاب میں بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ساتھ معیار اور اخلاقی پہلو کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ زیادہ تر کہانیاں معلوماتی، آزادی، اخلاقی، جادوئی، موضوعات کے گرد گھومتی ہیں۔

جیسے ''ڈھکن چور'' ایک دلچسپ اور مزے دار کہانی تھی۔ ''چور پکڑا گیا'' بھی اسی طرز کی دلچسپ کہانی ثابت ہوئی۔ جلیبیاں، دوستی کی کہانی ''چھے خرگوش، 15 سال 2 ماہ چار دن، حاسد پڑوسی، نیت بدلتے ہی، بہترین تحریریں تھیں۔ بڑی عید کی کہانیوں اور نظموں کے علاوہ آزادی کے رنگوں سے سجی کہانیاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔

ایک میگزین کی سب سے بڑی خوبی یا مقصد یہ ہی ہونا چاہیے کہ اپنے وطن کے ننھے زرخیز ذہنوں میں، حب الوطنی کے ساتھ، نیکی اور ایمانداری کے بیج بو کر ان کی نشوونما کا خیال رکھا جائے اور الف نگر اس ذمہ داری کو اچھے طریقے سے نبھا رہا ہے۔

نیک خواہشات

قرۃ العین خرم ہاشمی (لاہور)

☆ اتنے پیارے تبصرے کے لیے ممنون ہیں۔

جولائی اگست کا خوبصورت تحاریر سے مزین شمارہ ملا تو میری خوشی دیدنی تھی۔ الف نگر بلاشبہ ایک پیارا میگزین ہے جسے پڑھ کر ہم خوب لطف اندوز ہوتے ہیں، اس میں لکھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ جولائی، اگست کے ''الف نگر'' کی میں چند دنوں تک سیر کرتا رہا اور اس کے کاغذ کی خوشبو سانسوں میں اتارتا رہا۔ سرورق دیدہ زیب تھا سب ہی کہانیاں بہترین تھیں۔ میری کہانی ''ایمن کا بھیا'' شائع کرنے پر از حد شکریہ۔

قرۃ العین خرم ہاشمی صاحبہ جب بھی لکھتی ہیں، کمال لکھتی ہیں، بچوں کے لیے لکھی ان کی کہانیاں میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ ''میرا پیارا رابعہ'' انہوں نے ایک بہترین کہانی لکھی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسی بہترین کہانیاں لکھتی رہیں گی۔ تنزیلہ احمد کی کہانی ''مزے کی دنیا'' مزے کی تھی۔ امید کرتا ہوں کہ الف نگر میں ان کی مزید کہانیاں بھی پڑھنے کو ملیں گی۔ فرزین لہرا کی ''دگنا اجر'' مختصر مگر پر اثر کہانی تھی۔ سارہ قیوم کی کہانی ''چور پکڑا گیا'' بھی اچھی تھی۔ ہمارے پسندیدہ اور کہنہ مشق لکھاری نذیر انبالوی صاحب نے ہمیشہ کی طرح خوب لکھا۔ ''ہچکی'' میں اچھے انداز میں معلومات فراہم کی گئیں۔

نامور ادیب احمد ندیم قاسمی کی تحریر بہت پسند آئی۔ مدیرہ صاحبہ عائشہ اطہر کی کہانی ''ڈھکن چور'' نے لطف دیا۔ ''ننھی پریاں اور جن''، ''آزادی''، ''جس ارض وطن پر ظلم نہ ہو''، ''دوستی کی کہانی''، ''نارنجی سائیکل''، ''چھے خرگوش''، ''چی چی چوہے کی واپسی''، ''پالو کی آزادی'' بھی عمدہ تھیں۔ ''الف نگر'' رسالے کے کاغذ کا عمدہ معیار، ہر کہانی کے ساتھ خوبصورت اسکیچ، اور رنگین صفحات طبیعت پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں۔ الف نگر میرے پسندیدہ رسائل میں شامل ہے، اللہ کرے یہ یوں ہی مزید ترقی کرتا رہے اور ہم اس سے یوں ہی لطف اندوز ہوتے رہیں۔

سلمان یوسف سمیجہ (علی پور)

☆ آپ بلاشبہ ہمارے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ تبصرے کے لیے شکریہ

الف نگر جولائی، اگست کا شمارہ پڑھا۔ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے میں سب سے مشکل کام کہانیوں کو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کی دلچسپی بھی برقرار رکھنا ہے۔ الف نگر اس مشکل کام کو بہت خوبی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔

تمام کہانیوں میں ایک اچھا پیغام بھی تھا اور وہ بہت مزے دار بھی تھی ''دگنا اجر'' میں اٹک اٹک کر پڑھنے والے بچوں کے لیے خوشخبری تھی۔ میرا پیارا رابعہ ٹین ایج کے لڑکوں کی سوچ کے مثبت اور منفی دونوں پہلو دکھا رہی ہے۔ ''چور پکڑا گیا، میں آخر تک سسپنس برقرار تھا جو کہ سارہ قیوم کی کہانی کا خاصہ ہے۔ وہ قاری کو کتاب سے جوڑ کے رکھتی ہیں۔ ہلنے نہیں دیتی۔ '15 سال 2 ماہ'' میں معافی کی عظمت نہایت مہارت سے دکھائی گئی ہے۔ بچوں کی نفسیات اور ان کے مختلف جذبات کو اس میں بہت باریکی سے تحریر کیا گیا ہے۔ ''جس ارض وطن میں ظلم نہ ہو'' بچوں میں پاکستان کی محبت اور مٹی کے

قرض کو ادا کرنے کی سوچ اجاگر کی گئی ہے اور بہت خوبی سے کی گئی ہے۔ ''آزادی'' 14 اگست کو صرف باتیں نہیں عمل سے منانے کی تلقین کر رہی ہے۔ بچوں کو ملک سے محبت کا حق ادا کرنا بہت پریکٹیکل طریقے سے سکھا رہی ہے۔ ''مزے کی دنیا'' میں over eating اور کاہلی کے نقصانات کو بہت منفرد طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی کی سب سے اچھی بات، بچوں کے لیول پر آ کے اُن کو بات سمجھائی ہے ''پنکی'' نے بچوں کو کھیل، کھیل میں بہت خاص بات آسانی سے سمجھائی ہے احمد ندیم قاسمی صاحب کی جلیبیاں بھی اس شمارے میں شامل تھی۔ ان کی تحریر کے بارے میں بات کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بہت دلچسپ کہانی تھی۔ ''ڈھکن چور'' نے کہانی کے تمام تقاضے بہت اچھی طرح پورے کیے اور کہانی کے انجام تک دلچسپی کو برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ انداز تحریر بہت خوبصورت اور دلچسپ تھا۔ نثر نگاری اور کردار نگاری مزے دار تھی۔ خصوصی طور پر بین کی تفصیل وہ کیسے نظر آتے تھے۔ بہت خوبصورت لگے۔ ''چھے خرگوش'' ایک مزے دار اور سبق آموز کہانی تھی۔ نظیر فاطمہ کی چی چی چوہے کی واپسی نے بھی بہت لطف دیا۔ تبصرہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور کہانیاں ابھی باقی ہیں۔ الف نگر اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں میں نصرت عطا فرمائے اور ہماری نئی نسل میں اُردو پڑھنے کا شوق بیدار ہو۔ آمین

روبینہ کبیر خان (کراچی)

☆ بھرپور اور تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ

محترمہ مدیرہ صاحبہ

السلام علیکم

ہم سب گھر والوں کو ''الف نگر'' کا انتظار رہتا ہے اور وجہ میگزین کی دلچسپ کہانیاں اور مستقل سلسلے ہیں۔ ویسے تو یہ بچوں کا میگزین ہے پر ہمارے گھر میں سب بڑے بھی اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ دادا جان کی بیٹھک تو میری دادو بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اور میرے پاپا جی اُلٹے میاں خاص طور پر پڑھتے ہیں اور خوب دل کھول کر ہنستے ہیں۔ جولائی، اگست کا سرورق سب کو بہت ہی پسند آیا۔ انعام یافتہ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ میں کسی بھی میگزین میں پہلی بار تبصرہ لکھ رہی ہوں اُمید ہے کہ آپ میرا تبصرہ ضرور شائع کریں گی۔

طیبہ کلیم (راولپنڈی)

☆ خوش ہو جائیں آپ کا تبصرہ شائع ہو گیا۔

محترمہ مدیرہ صاحبہ

السلام علیکم!

میں نویں جماعت کا طالب علم ہوں اور آپ کا میگزین بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے میگزین کی سب سے اچھی بات مجھے یہ لگتی ہے کہ اُس میں ہر طرح کی کہانیاں ہوتی ہیں جیسے دینی معلومات میں ''دادا جان کی بیٹھک'' اور ''ہوشیار بد بد'' اخلاقی، سبق آموز اور فیری ٹیلز بھی میگزین کا حصہ ہوتی ہیں۔ جولائی، اگست کے شمارے میں مجھے نذیرا نبالوی کی 15 سال دو ماہ چار دن بہت اچھی لگی قرۃ العین خرم ہاشمی کی ''میرا پیارا رابعہ'' پیاری کہانی تھی۔ روبینہ کبیر خان کی کہانی ''آزادی سب کے لیے'' بالکل صحیح اوّل انعام کے قابل تھی۔ عائشہ اطہر کی کہانی ''ڈھکن چور'' ہلکی پھلکی کہانی تھی جس میں کہانی کے انجام تک دلچسپی برقرار رہی۔ جلیبیاں، ایمن کا بھیا، کالی بلی، نارنجی سائیکل اور اُلٹے میاں بہت ہی پسند آئے۔ مستقل سلسلے سب اچھے ہیں۔ اگر میں ہر مہینے تبصرہ بھیجوں تو کیا آپ لگائیں گی۔

والسلام

احمد علی سلطان (ریہ سلطان پور)

☆ جی ضرور لگائیں گے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جولائی، اگست کا خوبصورت سرورق والا شمارہ بہت ہی اچھا لگا۔ عید اور آزادی دونوں ساتھ ساتھ سب کو سرورق بہت پسند آیا۔ آپ نے انعامی سلسلوں کا آغاز کر کے بہت ہی اچھا کیا۔ سب انعامی کہانیاں بہت اچھی تھی۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ شیف ثانی کا چٹ پٹا قیمہ امی نے بنایا۔ بہت ہی مزیدار بنا۔ میری امی شیف ثانی کی ترکیب ضرور بناتی ہیں، اور ہم سب وہ کھا کر خوب تعریفیں بھی کرتے ہیں۔ مختصر کہانیاں سب اچھی تھی اور اُلٹے میاں کی بکرے کی خریداری تو بہت ہی پسند آئی۔ مدیرہ صاحبہ! ہمارے سب گھر والوں کو عمیرہ احمد بہت ہی پسند ہیں کافی عرصے سے شمارے میں اُن کی کوئی تحریر نہیں آئی۔ پلیز اُن کی کوئی تحریر اپنے شمارے میں لگائیں۔

انعام حاصل کرنے والوں کو مبارک ہو۔

والسلام

شمائلہ اکرام (واجل، راجن پور)

بیادِ اقبال

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی نظمیں عمیرہ احمد کی نثر میں

6 Books in Rs 1500

To Order

0321 8460220

Free Delivery

الف کتاب پبلی کیشنز کی بچوں کے لیے خوبصورت رنگین کتابیں!

آرڈر کے لیے رابطہ کریں! 0321 8460220